سلسلہ ابوالکلام آزاد صدی تقریبات

الہلال کے تبصرے



مرتبہ

پروفیسر محمود الٰہی

سلسلۂ مطبوعات - ۲۷۱

سلسلۂ ابوالکلام آزاد صدی تقریبات ۱۹۸۸ء

(۴)

الہلال کے تبصرے

مرتبہ

پروفیسر محمود الٰہی

اترپردیش اردو اکادمی

لکھنؤ

سلسلۂ ابوالکلام آزاد صدی تقریبات ۱۹۸۸ء

الہلال کے تبصرے

مرتبہ : پروفیسر محمود الٰہی

پہلا ایڈیشن : ۱۹۸۸ء

تعداد: ایک ہزار

قیمت : اٹھارہ روپے

رام کرشن ورما، سکریٹری اُتر پردیش اُردو اکادمی نے میسرس آفسیٹ پریس، گورکھپور سے چھپوا کر ہبرہ ہاؤس، قیصر باغ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

پیش لفظ

یہ کوئی مشکل سوال نہیں ہے کہ عہد آفریں شخصیتوں کا صد سالہ جشنِ پیدائش کس شکل میں منایا جائے ہر اہلِ نظر کے پاس اِس کا صائب اور معقول جواب موجود ہے۔ سوال ایک ہے لیکن جوابات مختلف ہو سکتے ہیں: وللناس فیما یعشقون مذاھب۔

اتر پردیش اردو اکادمی نے مولانا آزاد صدی تقریبات کا جو منصوبہ مرتب کیا ہے، اس کا محرک صرف یہ جذبہ ہے کہ مولانا کے فکر و فن سے متعلق جو مواد منتشر یا کمیاب ہے، اسے منظرِ عام پر لایا جائے تاکہ اُن کے اکتسابات کی قدر و قیمت کا تعین صحیح سیاق و سباق میں کیا جائے۔

'الہلال کے تبصرے' مواد کی فراہمی کی ایک کڑی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا آزاد نے بعض مصنفین کی تخلیقات پر مقدمہ لکھا تھا اور ان مقدموں سے ان کے تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے لیکن انھوں نے الہلال میں مطبوعاتِ جدیدہ پر جو تبصرے شائع کیے تھے، وہ عام طور پر نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں۔ اکادمی اِن گم شدہ اوراق کو اس لیے سامنے لا رہی ہے کہ اہلِ نظر مولانا آزاد کی تنقیدی بصیرت کو بھی اپنا موضوعِ قلم بنائیں۔

امید ہے کہ اکادمی کی سلسلۂ آزاد صدی کی دوسری مطبوعات کی طرح 'الہلال کے تبصرے' کو بھی حسنِ قبول ملے گا۔

محمود الٰہی
چیرمین، مجلسِ انتظامیہ

اتر پردیش اردو اکادمی
قیصر باغ، لکھنؤ
۲؍ستمبر ۱۹۸۸ء

ترتیب

پروفیسر محمود الٰہی

مُقدمہ

الہلال ہفتہ وار اخبار نہیں تھا بلکہ یہ ایک 'جرنل' تھا، جسے آسانی کے لیے مجلہ یا رسالہ کہہ لیجیے اور جرنل بھی وہ جس نے مغربی زبانوں کے معیار کو مشعلِ راہ بنایا تھا۔ کسی جرنل میں عام طور پر ایسا مواد پیش کیا جاتا تھا جو ایک طرف تو علم و ادب کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا اور دوسری طرف حیات شناسی اور کائنات کی گرہ کشائی کا محرک ثابت ہوتا تھا۔ مولانا آزاد نے بھی الہلال کے لیے یہی راہ اپنائی۔ اس میں تنوع تھا مگر تنوع کے نام پر سستا اور مبتذل مواد نہیں چھپایا جاتا تھا۔ مولانا آزاد کا شروع سے یہ خیال تھا کہ 'مطبوعات جدیدہ' یا 'انتقاد' کا ایک مستقل عنوان الہلال میں شامل کرنا چاہیے لیکن اس خیال کو عملی جامہ انھوں نے مارچ ۱۹۱۳ء میں پہنایا اور اس کے بعد مستثنیات سے قطع نظر اس میں برابر مطبوعاتِ جدیدہ یا 'انتقاد' کو جگہ ملتی رہی کبھی کبھی ایک ہی شمارے میں ان دونوں عنوانات کے تحت اظہارِ خیال کیا جاتا تھا لیکن مطبوعاتِ جدیدہ ہو یا 'انتقاد' ان کے مواد میں کوئی بیّن فرق نہیں ہوتا تھا۔

مولانا آزاد چاہتے تھے کہ الہلال کے قارئین کو نئی کتابوں اور جریدوں سے روشناس کرایا جائے اور اگر ہو سکے تو ان پر مختصر مگر جامع تبصرہ یا ریویو بھی شائع کر دیا جائے۔

اردو اخبارات اور جرائد میں اس طرح کے کالم کبھی کبھی نظر آجاتے تھے لیکن اس کے تحت جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ تقریظ ہوتی تھی، ریویو، تنقید یا تبصرہ نہیں ہوتا تھا۔ کتابوں کے ریویو کے باب میں مولانا شبلی اور مہدی افادی کی مراسلت کو لوگ بھولے نہیں ہوں گے۔ یہ ۱۸۹۰ء کی بات ہے جب مولانا شبلی نے مہدی افادی کو پہلا خط لکھا تھا۔ یہ خط ریویو سے متعلق تھا۔ مولانا شبلی کے خط کا متعلقہ اقتباس یہ ہے:

"ریویو کا جو تذکرہ آپ کے خط میں ہے، وہ شاید مناسب نہ تھا، گو آپ کا منشا نہ ہو لیکن اس سے متبادر ہوتا ہے کہ ریویو گویا کتاب کا ایک قسم کا معاوضہ ہے، حالانکہ مصنف کی بڑی پست

فطری ہے کہ وہ لوگوں سے ریویو لکھانے کا شایق ہو، اگر کوئی شخص کسی معقول کتاب پر ریویو لکھنے کی قابلیت رکھتا ہے تو ہر حالت میں اس کو لکھنا چاہیے لیکن ریویو کوئی آسان چیز نہیں ہے۔

ہمارے لیے ریویو نگاروں کے لیے یہی بہت ہے کہ ان کی یہ قابلیت تسلیم کی جائے۔ نہ کہ اس سے کسی مصنف پر احسان رکھا جائے۔ ملک میں شاید ایسے مضمون نگار دو تین سے زیادہ نہیں ہیں جن کے ریویو سے کسی مصنف کو خوشی ہو سکے۔"

مولانا شبلی نے ریویو کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس وقت کیا تھا جب مولانا آزاد ابھی مشکل سے دو سال کے تھے اور مہدی افادی مضمون نگاری کی دنیا میں قدم رکھنے کا ارادہ کر رہے تھے لیکن مولانا شبلی نے ریویو کے بارے میں جن حقایق کا ذکر کیا تھا، وہ الہلال کے اجرا کے وقت بھی ریویو نگاروں کے لیے سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا آزاد نے جب جولائی ۱۹۱۲ء میں الہلال جاری کیا تو انھوں نے نہ صرف ریویو نگاری کا تقدس ملحوظ رکھا بلکہ علم و ادب کے اس شعبے کو مداحی، تنقیص اور عصبیت سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ ریویو پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا آزاد نے لکھا تھا:

"...... ابنائے عصر نے "ریویو" کو تقریظ و مدحت سرائی" کا مرادف سمجھ لیا ہے اور جب کبھی کوئی چیز اخباروں میں ریویو کے لیے بھیجی جاتی ہے تو مقصود یہی ہوتا ہے کہ اس کی تعریف کی جائے ...... ہم چاہتے ہیں کہ جس قدر کتابیں ریویو کے لیے آئیں، جب تک ان پر ایک کافی نظر نہ ڈال لیں اور شناسانہ رائے دہی کے لیے مستعد نہ ہو جائیں، ایک لفظ حوالۂ قلم نہ کریں۔

ریویو نویس درحقیقت پبلک کی طرف سے بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر رکھتا ہے۔ وہ لوگوں کو مشورہ دیتا ہے کہ فلاں کتاب کا مطالعہ کریں، اور فلاں اخبار خریدیں۔ بس یہ ضروری ہے کہ یہ مشورہ پوری امانت داری اور دیانت پژوہی کے ساتھ ہو۔"

مولانا شبلی نے ریویو نگاری کی جو ذمہ داریاں مہدی افادی کو اجمالاً بتائی تھیں اُن کی تفصیل مولانا آزاد نے مندرجہ بالا اقتباس میں بیان کی ہے۔

الہلال میں جو تبصرے شائع ہوتے تھے، وہ کسی ایک موضوع سے متعلق نہیں ہوتے تھے۔ اس میں مذہب سے لے کر طب تک اور زبان و ادب سے لے کر سیاست تک متعدد ملکی اور غیر ملکی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے شامل ہوتے تھے۔

ہر چند الہلال اپنی اشاعتی زندگی کے تین ادوار سے گزرا لیکن اس کے تبصروں کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ الہلال کا پہلا دور ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء سے شروع ہو کر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا دور البلاغ ہے جو نومبر ۱۹۱۵ء سے مارچ ۱۹۱۶ء کے زمانے کو محیط ہے اور اس کا تیسرا اور آخری دور جون ۱۹۲۷ء سے شروع ہوتا ہے اور دسمبر ۱۹۲۷ء پر ختم ہو جاتا ہے۔ تبصرہ کتب کے لحاظ سے الہلال کے پہلے اور دوسرے دور کو ایک ہی خانے میں رکھنا چاہیے اور دوسرا خانہ وہ ہے جس میں الہلال کے ۱۹۲۷ء والے دور کے تبصرے آئے ہیں۔

الہلال کے پہلے دو ادوار کی مابہ الامتیاز بات یہ ہے کہ اس کے اکثر تبصرے مسلّمہ طور پر مولانا آزاد کے رشحاتِ قلم ہیں۔ ہر تبصرے میں کہیں نہ کہیں ضمیر متکلم کا استعمال ہوا ہے اور یہ ضمیر متکلم صرف مولانا آزاد کے علاوہ اور کسی پر منطبق نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۲۷ء کے تبصروں کے بارے میں حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مولانا آزاد کے لکھے ہوئے ہیں یا دوسروں کے رہینِ منّت ہیں۔ یہ تبصرے سے زیادہ تعارف و تلخیص کے دائرے میں آتے ہیں۔ اتنی بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ اس دور کے تبصروں میں بھی کبھی کبھی مولانا آزاد کے قلم کا پرتو نظر آجاتا ہے۔ یہ پرتو اصلاح و تصحیح کے پردے میں ہو یا حذف و اضافہ کے لباس میں۔

الہلال کے تبصروں کی جان وہی ہے جو مولانا آزاد کے لکھے ہوئے ہیں اور جن کی اشاعت الہلال کے پہلے دور میں عمل میں آئی تھی۔ ان تبصروں میں مولانا نے صرف یہی نہیں بتایا کہ متعلقہ موضوع پر کیا کہا گیا ہے بلکہ انھوں نے زیادہ زور اس پر صرف کیا ہے کہ اس موضوع کے مقتضیات کیا ہیں اور ان کے ساتھ مصنف نے کس حد تک انصاف کیا ہے۔ یہ تبصرے نہیں ہیں بلکہ مولانا کی ہمہ گیر دانشوری کے مظاہر ہیں۔ وہ کثیر المطالعہ تو تھے ہی، وہ یہ بھی سوچتے رہتے تھے کہ علم و ادب کے مختلف شعبوں میں کیا کمیاں ہیں اور انھیں کس طرح دور کرنا چاہیے۔

مذہب ہو یا سیاست منطق ہو یا فلسفہ، صرف و نحو ہو یا حفظانِ صحت، بچوں کا ادب ہو یا فکشن اور شعر و شاعری، ہر موضوع پر مولانا نے سوچا تھا اور اپنے نتائجِ فکر کو تبصرے کے ذیل میں ظاہر کر دیا تھا۔

حریت پسندی، نظم و انضباط، بے خوفی و بے ریائی، صحت مند عقلیت، اجتہادِ فکر و نظر اور تقلید و تضنع سے بیزاری مولانا آزاد کی شخصیت کے نقوش ہیں اور یہ نقوش جب مثبت انانیت سے کسب نور کے بعد ابھرتے ہیں تو ان کی کشش اور بڑھ جاتی ہے۔ مولانا آزاد کے تبصروں میں یہ سارے نقوش نظر آجاتے ہیں

اسی لیے یہ ہمارے علم و ادب میں ایک وقیع اضافے کی حیثیت سے یاد کیے جائیں گے۔ مولانا آزاد تبصرے کو تنقید کا ایک شعبہ سمجھتے تھے اور انھوں نے ثابت کر دیا کہ کتابوں پر تبصرہ لکھنے والا بھی قد آور نقادوں کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل مولانا آزاد کے تبصروں کے مندرجہ ذیل اقتباسات میں دیکھی جاسکتی ہے:

"اُردو زبان کی ابتدائی تعلیم اور رسم الخط کا مسئلہ بھی ایک اہم اور توجہ طلب مسئلہ ہے۔"

اُردو زبان کی ترقی و اشاعت میں یہ بات ہمیشہ عجیب سمجھی جائے گی کہ ایک طرف تو علوم و فنون کی کتابیں اس میں لکھی جا رہی ہیں اور دوسری طرف کوئی جامع لغت بلکہ مکمل صرف و نحو تک موجود نہیں ہے اور بیسیوں صرفی و نحوی مسائل ہیں، جو اب تک غیر فیصل شدہ ہیں!"

"بورڈ آف اگزامنرس کلکتہ نے گزشتہ نصف صدی کے اندر صرف و نحو میں کتابیں لکھنے اور لکھوانے کی متعدد کوششیں کیں، اور اس سے باہر بھی ملک میں متعدد کتابیں لکھی گئیں مگر سچ یہ ہے کہ اب تک کوئی جامع اور ہر طرح معتبر کتاب ملک کے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

"اب خطبے کے یہ معنی رہ گئے ہیں کہ عربی زبان میں ایک چھپی ہوئی کتاب جو بازار سے خرید لی جائے اور الف لیلہ کی طرح اس میں سے ایک خطبہ غلط سلط پڑھ کر سنا دیا جائے......... بسا اوقات پڑھنے والا بھی نہیں جانتا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں....... پھر سننے والوں کی مصیبت کا کیا پوچھنا؟ کوئی اونگھتا ہے، کوئی اپنے ساتھیوں سے صبح کے بازار کا بھاؤ پوچھتا ہے۔!"

"عبارت میں یکسانی اور مواقع و مناظر کا اقتضا ملحوظ رکھنا ہمیشہ ضروری ہے اور افسانہ و قصص میں تو لازم و ملزوم لیکن "زہرہ" میں تو جابجا شترگربہ پایا جاتا ہے نیز اشخاص افسانہ کے حالات سے موزوں بھی نہیں۔ عام محاورات اور عامیانہ الفاظ ایک مقام پر بھی ہوں تو پوری کتاب کی وقعتِ ادبی پر اثر ڈالتے ہیں۔"

"کتاب کی عبارت شگفتہ و رواں ہے۔ دربار اکبری کے طرز تحریر کی جابجا کوشش کی ہے البتہ یہ بات مجھ میں نہیں آتی کہ تمام کتاب کو محض ایک مسلسل سرگزشت کی صورت میں کیوں لکھا گیا؟ پوری کتاب میں ابواب و فصول یا عہد و سنین کی کوئی تقسیم نہیں۔ علاوہ اس کے کہ تاریخی تصنیفات کے لیے یہ طریق موزوں نہیں، پڑھنے والے کو بھی اس سے الجھن ہوتی ہے اور وہ ایک ایسی سڑک میں گھر جاتا ہے جو بغیر کسی موڑ کے میلوں چلی گئی ہو!"

"ہماری زندگی کا یہ حال ہے کہ ہم نے یورپ سے وہ لباس تو سیکھ لیا ہے جو بہت قیمتی، بہت خوش قطع، اور بہت شاندار ہے۔ یقیناً ہم جب کبھی بازار میں سے گزرتے ہیں یا کسی جلسے میں نظر آتے ہیں، تو از سرتا پا مجسمہ تہذیب و مدنیت ہوتے ہیں، لیکن اگر وہی شخص جو ہمیں کچھ دیر پہلے اس شانِ تہذیب آرا میں دیکھ چکا ہے، ہمارا تعاقب کرے اور گھر کے اندر کی زندگی کو دیکھے، تو بدنظمی و بدسلیقگی، بدتہذیبی و بے ترتیبی، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اور کثافت و غلاظت کے آثار کے ساتھ، منزلی وحشت و حیوانیت کا ایک پورا نمونہ دیکھ کر متحیر رہ جائے گا۔"

"رباعیات عمر خیام کی اصلی تعداد کا مسئلہ اب تک مختلف اور ایک حد تک مشتبہ ہے مختلف نسخے جو یورپ اور مشرق میں پائے جاتے ہیں، باہم تعداد میں مختلف ہیں۔ مصنفینِ یورپ نے ان کی تحقیقات و کشفِ حقیقت کے لیے بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔

سب سے زیادہ قدیم نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا ہے جو آٹھویں صدی ہجری کے اواخر کا لکھا ہوا ہے یعنی عمر خیام کی وفات سے تقریباً تین سو برس بعد کا۔ اس میں ۴۰۲ رباعیاں ہیں۔ میں نے یہ نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی میں ممبر ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ نکلوانا چاہا تو معلوم ہوا کہ لندن گیا ہے اور غالباً مسٹر اڈورڈ براؤن نے منگوایا ہے۔ اب عرصے سے بالکل مفقود الخبر ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں گیا؟"

"تصوف و اخلاق، سنائی و عطار، دونوں کہتے ہیں۔ رزم و جنگ فردوسی اور نظامی،

دونوں نے لکھا ہے۔ خمریات اور جام و صراحی حافظ کی طرح سب کے ہاتھ میں ہے، تغزل اور رازو نیازِ عشق سے سعدی کی طرح خسرو اور نظیری کی طرح عرفی کی کائناتِ شعر بھی معمور ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ گو ان سب کا لباس اور شکل و صورت ایک ہے لیکن ادائیں تو خاص خاص ہیں جو کسی طرح صاحبانِ نظر سے چھپ نہیں سکتیں:

من اندازِ قدت را می شناسم

میں تو کہتا ہوں کہ اس شخص کے لیے فارسی شاعری کے ذوق و مطالعہ کا دعوا حرام ہے جس میں اتنی ادا شناسی بھی نہ ہو کہ صرف کلام سُن کر ایک شاعر کو اس کے دوسرے ہم رنگ و ہم فکر شاعر سے تمیز کر لے:

ہر کہ خواہد میل دیدن، در سخن بیند مرا!"

"کتنے ہی اربابِ علم و فضل ہیں جن کا جوہرِ علمی آج صرف اِس لیے رائگاں جا رہا ہے کہ اُن کو امن کی ایک رات اور دل جمعی کی ایک صُبح بھی نصیب نہیں۔ کتنے ہی اربابِ قلم ہیں جو بہتر سے بہتر علمی خدمات انجام دے سکتے ہیں لیکن ان کی تمام قابلیت کچھ نہیں کر سکتی کیوں کہ اتنی استطاعت بھی نہیں رکھتے کہ ضرورت کی چند کتابیں خرید سکیں کتنے ہی صاحبانِ استعداد و فکر ہیں جن کے لیے اصلی مشغلہ علم و فن کا تھا لیکن اُن کا سارا وقت اس میں خرچ ہوتا ہے کہ:

چہ خورد بامداد فرزندم

لوگ اِس پر ماتم کرتے ہیں کہ جانے والے چلے گئے، مگر کسی کی آنکھ نہیں روتی کہ جو باقی ہیں اُن کی خبر لیں۔"

"سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ قابلِ ذکر خصوصیت جو اس کتاب کو موجودہ عہد کی بہترین مصنفات کا درجہ دیتی ہے، وہ اجتہادِ فکر و استقلالِ رائے ہے جس کی روشنی کتاب کے ہر مبحث میں نمایاں ہے۔ یہ وہ فضیلتِ عظمیٰ و مزیتِ کبریٰ ہے کہ اگر کتاب میں اور کچھ نہ ہوتا، اور آٹھ سو صفحوں کے اندر صرف ایک سطر بھی اس دولتِ عظمیٰ سے بہرہ در ہوتی، جب

بھی صاحب "معراج العقول" کے شرف و امتیاز کے لیے کافی تھا۔"

ان اقتباسات سے مولانا آزاد کی تبصرہ نگاری کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ ادبی کتابوں پر تبصرے کے لیے قلم اٹھاتے ہیں تو ادبی تنقید کے ادا شناس معلوم ہوتے ہیں اور جب علمی اور فنی کتب پر وہ تبصرہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کوچوں کے ذرّے ذرّے سے واقف ہیں۔ اب تک ایک مبصر کتب کی حیثیت سے مولانا آزاد کے جوہر کو نہیں پرکھا گیا ہے۔ زیر نظر تبصرے آزاد شناسی کی ایک اور راہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔

الہلال کے دورِ اوّل میں اکبر الٰہ آبادی، مولانا شبلی اور شمس اللہ قادری کے بعض تبصروں کو بھی جگہ ملی ہے، یہ تبصرے بھی کم وقیع نہیں ہیں۔

الہلال کے تبصروں کے اس مجموعے میں بعض تبصرے شامل نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ صفحات کی حد بندی ہمارے پیشِ نظر تھی۔ اور اسی حد بندی کی وجہ بعض تبصروں کے صرف ضروری اقتباسات شامل کیے گئے ہیں

الہلال کے تبصرے

مطبوعات اردو

نہایت شرمندہ ہیں کہ ریویو کے لیے کتابیں بکثرت آتی رہیں لیکن ہم نے آج تک ایک لفظ نہیں لکھا۔ بعض حضرات کی شکایتیں اس بارے میں سوءِ ظن تک پہنچ گئی ہیں، مگر اپنی مجبوریوں کو کیا کریں؟

سب سے پہلی بات یہ کہ الہلال کے پیشِ نظر جو نمونے ہیں، وہ ہندوستان سے باہر کے ہیں۔ جب احباب اپنی عزت افزائی سے تعریف کرتے ہیں، تو ہم اپنے دل میں شرمندہ ہوتے ہیں کہ آٹھ دس صفحوں میں چند ادھر ادھر کے مضامین شایع کر دینے کے سوا اور اس میں ہوتا ہی کیا ہے؟ یورپ کے رسائل کو چھوڑ دیجیے، کم از کم ترکی کے بعض ترقی یافتہ رسائل کی ضخامت اور تنوعِ مضامین کا مقابلہ تو کر سکتا۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں یاد آجاتا ہے کہ ان رسائل کی قیمت کتنی ہے، اور کتنا وسیع حلقۂ اشاعت اپنے ساتھ رکھتے ہیں؟

این نیست کہ صحرائے سخن جادہ ندارد
واز وں روش کج نظری راچہ کند کس؟

ان حالات کی وجہ سے اگر کتابوں پر ریویو کا صفحہ بھی ہمیشہ الہلال میں رکھا جائے تو اور ضروری مضامین کے لیے جگہ کہاں سے آئے؟

پھر اس سے بھی بڑھ کر دقت یہ ہے کہ ابنائے عصر نے "ریویو" کو "تقریظ و مدحت سرائی" کا مرادف سمجھ لیا ہے، اور جب کبھی کوئی چیز اخباروں میں ریویو کے لیے بھیجی جاتی ہے، تو مقصود یہی ہوتا ہے کہ اس کی تعریف کی جائے۔ فقہا کا اصول ہے کہ "اصل ہر شے کی اباحت ہے تاوقتیکہ کوئی شے عارضِ حرمت نہ ہو۔" اسی طرح اخبارات نے بھی یہ اصول قرار دے لیا ہے کہ "اصل نقد اور ریویو کی مدح ہے، تاوقتیکہ ہمارے اغراضِ ذاتی کے منافی نہ ہو۔"

یہ اصول خواہ کتنا ہی قابل ذم ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ آسان بہت ہے کتابوں کا ڈھیر سامنے رکھا، اور رسمی الفاظ مدح و تحسین تقسیم کرتے گئے۔

کاش اس آسانی اور سہل کاری سے ہم بھی فائدہ اٹھا سکتے۔ مگر افسوس کہ ہمارے لیے ہر کام میں دقتیں ہی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ جس قدر کتابیں ریویو کے لیے آئیں، جب تک ان پر ایک کافی نظر نہ ڈال لیں، اور شناسانہ رائے دہی کے لیے مستعد نہ ہو جائیں، ایک لفظ حوالۂ قلم نہ کریں۔ ریویو نویس درحقیقت پبلک کی طرف سے بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر رکھتا ہے۔ وہ لوگوں کو مشورہ دیتا ہے کہ فلاں کتاب کا مطالعہ کریں، اور فلاں اخبار خریدیں۔ پس یہ ضروری ہے کہ یہ مشورہ پوری امانت داری اور دیانت پژوہی کے ساتھ ہو، کہ "المستشار موتمن۔"

لیکن اس کے لیے بڑا وقت چاہیے۔ جن لوگوں کو اپنے کتب خانے کی تازہ ترین اور جدید الاشاعت ذخیرۂ علوم کے مطالعہ کا موقعہ نہیں ملتا، وہ آج کل کے اردو پریس کی نکلی ہوئی مطبوعات کے مطالعہ کے لیے کہاں سے وقت لائیں؛

ممکن تھا کہ یہ کام ہم کسی اور صاحب کے حوالے کر دیتے، مگر اول تو ابھی دفتر خود ہی قحط الرجال کا مرثیہ خواں ہے، پھر ڈرتے بھی تھے کہ الہلال میں جو کچھ نکلے گا، وہ ہماری طرف منسوب ہوگا۔ اور کتابوں کی نسبت نہیں معلوم کیا رائے قائم کی جائے اور کیا لکھ دیا جائے۔

ایک یورپ کے اخبار و رسائل ہیں جن کو علم و فن سے بہترین مطبوعات کے نقد کے لیے جگہ نکالنی پڑتی ہے۔ ایک ہماری قسمت ہے کہ ہر شخص جو قلم پکڑ سکتا ہے، چند صفحے سیاہ کر کے چھپوا لیتا ہے اور پھر تمام اخباروں کو ذمہ دار سمجھتا ہے کہ کیوں نہیں اپنے کالم کے کالم اس کی مدحت سرائی کے لیے وقف کر دیتے؛

بہرحال اس مشکل کا علاج کچھ نہیں۔ کتابیں ہر طرح کی اس کثرت سے جمع ہو گئی ہیں کہ اگر چند سطروں میں بھی ذکر کیا جائے تو بھی صفحوں کے صفحے مطلوب۔ ہم آج تک اس امید سے جمع کرتے رہے کہ شاید دیکھنے کا وقت ملے، مگر افسوس کہ آج تک وقت نہیں ملا اور کس کو معلوم کہ کل ملے گا؛ مجبوراً بالفعل یہی کرتے ہیں کہ کتابوں کی ایک ڈھیری بغیر کسی

ترتیب و تقدم و تاخر کے سامنے رکھ لیتے ہیں، اور ٹائٹل پیج، فہرست، اور درمیان کے صفحوں پر ایک نظر ڈال کر، لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ریویو نہیں بلکہ ایک طرح کی رسید کتب، اور یا محض اعلان ہے۔ سردست اسی پر قناعت فرمائیے۔ حضرات مصنفین کرام سے معافی خواہ ہیں اس تاخیر کے لیے، جو ہوئی اور اس کے لیے کے لیے جس پر خود بھی ہم متاسف ہیں۔ آئندہ نمبر سے یہ کام کسی اور صاحب کے متعلق کر دیتے ہیں، اور پھر امید ہے کہ شکایت کا موقع نہ ہو۔

یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ "انتقاد" الہلال میں ایک ضروری باب رہے گا، جس کا اصلی مقصد یورپ اور ممالک اسلامیہ کی جدید مطبوعات پر نقد و بحث و مذاکرہ ہے، یا پھر ہندوستان کی بعض مخصوص اور اہم مطبوعات پر، مثلاً (کتاب الانساب سمعانی) پر ہم ریویو لکھ رہے ہیں، جو حال میں یورپ سے شایع ہوئی ہے۔

(الہلال، ۱۹ مارچ ۱۹۱۳ء)

ترجمۂ تفسیر کبیر

(اردو جلد اول)

قیمت ۲ روپیہ۔ ادارۂ الہلال

علامۂ (رازی) رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کبیر کا یہ اردو ترجمہ ہے، جس کو جناب مولوی محمد اسحاق صاحب دہلوی نے مرتب فرمایا ہے۔

تفسیر (کبیر) کی نسبت اگر کچھ لکھوں تو کئی صفحے مطلوب۔ کبھی نہ کبھی تفصیل طور پر اس موضوع پر لکھنا ضرور ہے، لیکن یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ (تفسیر کبیر) علم تفسیر، کلام و عقائد، اختلاف ملل و مذاہب، اور جمع معقول و منقول کا ایک ایسا ذخیرہ ہے، جو اگر آج موجود نہ ہوتا؛ تو نہیں معلوم، کن کن اہم مباحث اور معلومات سے ہم محروم رہ جاتے؛

قدماء (معتزلہ) نے تطبیق معقول و منقول اور انداز کلام و حکمت پر تفسیر لکھنے کی بنیاد رکھی۔ تاریخ و تراجم میں ہم ان تفسیر کا حال پڑھتے ہیں۔ مگر بد قسمتی سے (فہرست ابن الندیم) اور (حاجی خلیفہ) کے باہر ان کا کوئی وجود نہیں۔ وہ تمام سرمایہ ہماری محرومی سے ضایع ہوگیا۔ آج نہ (قفال کبیر) کی تفسیر کا پتہ ہے نہ (ابو بکر اصم) کا۔ نہ (ابو القاسم بلخی) کی تفسیر ملتی ہے، جس کی نسبت (ابن خلکان) لکھتے ہیں کہ "۱۲ جلدوں میں تھی اور تاریخ اسلام میں پہلی ضخیم تفسیر ہے۔" اور نہ (ابو مسلم اصفہانی) کی وہ تفسیر (جامع التاویل والمحکم التنزیل) ملتی ہے، جو فی الحقیقت ایک ذخیرۂ مباحث حکمیہ و معارف کلامیہ تھی، اور جس کی نسبت خود امام رازی کا قول ہے کہ "حسن الکلام فی التفسیر، کثیر الغرض علی الدقائق واللطائف۔"

اگر امام (طبری) کی تفسیر نہ نکل آتی، تو حکیمانہ انداز کی تفاسیر کی طرح، نقل و روایات و جمیع احادیث و آثار کا بھی تفسیر میں کوئی بڑا ذخیرہ ہمارے پاس نہ تھا۔

پس تفسیر کبیر قرآن مجید کے اکثر مشکل مقامات تفسیر کی نسبت جو عمدہ اور بصیرت افزا مباحث رکھتی ہے، اس سے بھی بڑھ کر ہمارے نزدیک اس کی خصوصیت یہ ہے کہ آج یہی ایک تفسیر ہے، جس کے ذریعہ سلف و قدماء کے معارف و مباحث کا پتہ چل جاتا ہے، اور ہر مسئلہ کی نسبت ہر طرح کی آراء و توجیہات سامنے آجاتی ہیں۔ اگر یہ تفسیر ناپید ہو جاتی، تو نہیں معلوم کیسی سخت تاریکی میں ہم اپنے آپ کو پاتے۔

جناب مولوی اسحاق صاحب نے اسی تفسیر کے اردو ترجمہ کی بنا ڈالی ہے، اور پہلا تذکرہ ہمارے سامنے ہے۔ سرسری نظر میں ہم جس قدر اندازہ کر سکے، ترجمہ سلیس، عام فہم اور مطلب خیز ہے۔ تقطیع بڑی، اور کاغذ اور چھپائی نہایت عمدہ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کتاب کے عالی ہمت پبلشر نے ہم کو اطلاع دی ہے کہ جس قدر نسخے اس کے فروخت ہوں گے، ان کی نصف قیمت چندہ (ہلال احمر) میں دیدیں گے، اس کا حساب دفتر الہلال کے ذمہ چھوڑ دیا ہے۔ پس ہم سفارش کرتے ہیں کہ ناظرین الہلال ایک ایک نسخہ اس کتاب جلیل کا ضرور خریدیں، ان کی ہر طرح کی معلومات میں اضافۂ خطیر ہوگا۔

(الہلال: ۱۹ مارچ ۱۹۱۳ء)

وِدھ دی ٹرکس اِن ٹرِپولی

WITH THE TURKS IN TRIPOLI

مسٹرای۔ این۔ بنیٹ (E. N. Benit) کے سیاحت نامۂ طرابلس کا ذکر اردو اخبارات میں بارہا ہوچکا ہے، اور اس کے اقتباسات اکثر اخبارات نے شایع کیے ہیں۔ جس صداقت اور بے تعصبی کے ساتھ اس شریف انگریز اہل قلم نے حالات جنگ پر بحث کی ہے، اور ضمناً ترکوں اور اسلام کے متعلق جو پرعواطف خیالات ظاہر کئے ہیں، وہ یقیناً ہماری شکر گذاری کا مستحق ہیں۔

موجودہ زمانے میں جنسی و سیاسی تعصب جس خوفناک و تاریک درجہ تک پہنچ گیا ہے، وہ قرون مظلمہ (Middle Ages) کے مذہبی تعصبات کے خونین مصائب سے بھی زیادہ عالم انسانیت کے لیے خطرناک ہے۔ یہ سچ ہے کہ اب کوئی عدالت تعذیب روحانیین (Inquisition) نہیں ہے، جو کافروں اور ساحروں کو زندہ جلا دیتی ہو، تاہم وہ متمدن قومیں اپنے ترقی یافتہ قواے جنگ، اور ناقابل مقاومت وسائل تسلط کے ساتھ موجود ہیں، جو لاکھوں انسانوں کو باسم تہذیب و دعوت مدنیت، محض اس جرم پر قتل کر دینا جائز سمجھتی ہیں، کہ وہ نسل قوقاسی سے نہیں ہیں، یا ہیں تو جنس ابیض کے وجود کی موجودگی میں ان کا وجود کچھ ضروری نہیں۔

اسی جنسی تعصب کی یورپ کے موجودہ افکار و اقلام پر حکومت ہے۔ تاریخیں، سفرنامے سیاسی اسفار، اور اخبار و رسائل، غرضیکہ قلم اور سیاہی کی آمیزش سے جس قدر اشیا طیار ہو سکتی ہیں، ان سب کے اندر اسی جنسی تعصب کا شیطان حلول کر گیا ہے۔ نامور اہل قلم، اور قابل سے قابل مغربی سیاح، جب مشرقی اوضاع و اطوار اور عادات و خصائل کی تصویر کھینچتا ہے تو اپنے قلم کو اس تعصب کے رنگ و روغن سے الگ نہیں رکھ سکتا۔

علی الخصوص مغرب و مشرق، اور اسلام و مسیحیت کی جنگ آرائیوں میں انصاف اور

صداقت بالکل ایک بے اثر جذبہ ہوگیا ہے۔

یہ فی الحقیقت دنیا اور انسانیت کے لیے ایک مصیبت عظمیٰ ہے، اور تمام گذشتہ ازمنۂ ظلم و ظلمت سے، باایں ہمہ شیوع علم، و ترقیات علمیۂ عظیمہ، و رفع منار مدنیۃ و عمران، و اتحاد و تبادل آراء اقوام و ملل، و ادعائے مساوات و نوع پرستی و بے تعصبی، زیادہ خطرناک و مہلک اور ایک خوفناک ترین دور انسانی ہے۔

پھر جنسی تعصب کے ایک ایسے تاریک عہد میں جو خال خال چند نفوس صالحہ یورپ کی سرزمین میں نظر آجاتے ہیں، اور قومی پاسداری کی خباثت سے پاک و بری ہو کر منصفانہ اظہار حق کرتے ہیں، ان کے وجود کو بسا مغتنم اور ان کی خدمت انسانیۃ کو مستحق تحسین و امتنان یقین کرنا چاہیے۔

ایسے ہی لوگوں میں سے ایک قابل تمجید شخص، کتاب زیر بحث کے مصنف مسٹر ای۔ ان۔ بینٹ بھی ہیں۔

جنگ طرابلس کے شروع ہوتے ہی وہ معائنہ حالات کے لیے روانہ ہوگئے۔ غالباً اخبار مانچسٹر گارجین کی نامہ نگاری کی حیثیت سے گئے تھے۔ تیونس کا راستہ، جو اس وقت اندرون طرابلس کے لیے ایک ہی دروازہ تھا، اختیار کیا۔ درنہ پہنچ کر ترکی کیمپوں میں ٹھہرے اور تین بڑی لڑائیوں کو اپنے سامنے دیکھا۔ یہ وقت جنگ کا اصلی زمانہ تھا۔ اندرون طرابلس اور صحرا کے عربی قبایل جوق جوق آرہے تھے، شیخ سنوسی کی ہمدردی پوری طرح حاصل ہوچکی تھی۔ اطالیوں کی پے در پے شکستوں اور ناکامیوں نے جراتوں اور ہمتوں کو بڑھا دیا تھا، اس لیے ان کو اصلی حالات معلوم کرنے، اور صحیح رایوں کے قایم کرنے کا پورا موقع ملا۔ وہ ترکی افسروں کے ساتھ کیمپوں میں رہے۔ عربوں کے ان صحرائی خیموں میں، جن کے اجزائے ترکیبی ایک پھٹے ہوئے کمل، اور ایک کسی درخت کے خشک شاخ سے زیادہ نہیں ہوتے، بارہا بیٹھے اور ان کے جذبات ملیہ و دینیہ کا مطالعہ کیا۔ وہ بادیہ نشین قبایل، جو ہزاروں کی تعداد میں ترکی کیمپوں کے سامنے کے میدانوں میں، اپنے اونٹوں کے پاس، کھلے آسمان کے نیچے پڑے رہتے تھے، اور جوش فداکاری ملت، و حفظ خاک وطن مقدس، و عشق

اسلام محبوب میں نہ دن کی ریگستانی تپش کی انھیں پروا تھی، اور نہ رات کی مہلک اور مرض پرور ہوا و رطوبت کی، ان کے سامنے تھے اور ان کو پورا موقع حاصل تھا کہ اسلام کی جنگی وسیاسی قوت کے اس آخری غیر مستعمل خزانے کی قدر وقیمت کا اندازہ کریں۔

پس ان کا سفر گو مختصر تھا، لیکن ان نادر مواقع کی وجہ سے بہترین مواد، اور قابل وثوق آرا کے جمع کرنے کا سامان اپنے ساتھ لائے اور جس سنجیدہ انداز روایت، اور منصفانہ طریق بحث واستدلال کے ساتھ انھوں نے اس سے کام لیا، وہ ایک عام سیاحت نامے کی سطح سے اس ناکمل روزنامچے کی قیمت بڑھا دیتا ہے۔

اٹلی کے اس حملے اور نیز یورپ کے موجودہ ظالمانہ وقاتلانہ حرص کا انھیں نہایت درد وتاسف سے اعتراف ہے۔ صدہا مواقع پر انھوں نے اہل عرب کی قوت وشجاعت اور جانفروشی وجذبات صحیحہ کی داد دی ہے۔ غیر قوموں کے ساتھ عربوں کے وحشیانہ سلوک اور اسلام کے تعصب کے افسانوں پر جابجا ہنسی اڑائی ہے۔ جن عربوں کو یورپ میں وحشت وبربریت کا خوفناک دیو سمجھا جاتا ہے، انھوں نے دیکھا کہ فرشتوں کی سی مہربانی، اور قدوسیوں کی سی نیکی کے ساتھ وہ ان سے ملے، ان کی دعوتیں کرنی چاہیں، اور ان کے منصفانہ خیالات کے شکرگزار ہوئے۔

عربوں کی شجاعت وجانفروشی کی شہادتوں نے جب ایک عالم کو متحیر کر دیا، تو بعض اخبارات نے اس اثر کو بے وقعت کرنے کے لیے طرح طرح کے افسانے مشہور کیے مثلاً لکھا کہ ترکوں سے ان کو بیش قرار رقمیں ملتی ہیں، اور اگر ایک دن کا وظیفہ بھی نہ ملے تو فوراً اٹلی سے مل جائیں۔

مگر مسٹر بینیٹ نے جو حالات دیکھے، وہ بالکل اس کے متضاد تھے۔ وہ آغاز کتاب ہی میں لکھتے ہیں:-

"عربوں کے لیے نومبر کے مہینے میں جب بارش ہوتی ہے، بڑی سخت آزمائش کا وقت تھا، لیکن انھیں ذرا بھی لغزش نہ ہوئی۔ چنانچہ طرابلس کا واقعہ ہے کہ جب ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۰ء تک بوجہ امساک باران

قحط پڑا تھا، تو ہزاروں عرب فاقہ کشی کی مصیبت سے تنگ آکر تیونس وغیرہ ترک وطن کر کے چلے گیے تھے۔ لیکن اس موقع پر جب کہ باران رحمت کا نزول ہوا تو میدان جنگ میں تھے، اور اپنے کھیتوں سے منزلوں دور۔ بعض ان میں سے تھوڑے سے دنوں کے لیۓ کھیتی کی غرض سے گۓ، لیکن اکثروں نے اپنے آئندہ نفع کو حب وطنی پر قربان کر دیا اور باوجود اس اندیشہ کے، کہ آئندہ انھیں اور نیز ان کے بال بچوں کو رزق میسر آنا ناممکن ہوگا، اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

اٹلی والے رشوتیں دے کر اپنا وہ کام نکالنا چاہیں گے، جس کام کو بزور شمشیر انجام دینے کے ناقابل ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اسلامی قوت دیکھیں عربوں کے فطری لالچ پر غالب آۓ گی۔"

جیسا کہ مسٹر بینیٹ نے بھی لکھا ہے، یہ ضرور تھا کہ عربوں کو ان کے ضروری مایحتاج کے انتظام کے لیے ایک رقم ضرور دی جاتی تھی، مگر ظاہر ہے کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ وہ، جو اپنی زراعت، اور اپنے اصلی وسائل گذران چھوڑ کر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے آگۓ تھے کیا اس کے بھی مستحق نہ تھے کہ دو وقت کے کھانے کے لیۓ چند آنے روز دیے جائیں؟ پھر یہ کوئی ایسی رشوت تو نہ تھی جو ترک اٹلی کے قیمتی تحفوں اور طلائی طشتوں کو ٹھکرا دینے کے معاوضے میں انھیں دیتے ہوں، اور نہ ان کے لیے محرک جنگ ہو سکتی تھی۔

اصل یہ ہے کہ جنگ عرب کا اصلی مذاق ہے۔ تاریخ نے بتلا دیا ہے کہ عرب ہر کام کے لیے موزوں ہے۔ تخت پر فرماں روائی کے لیے بھی، اور امن کے تمدن و تہذیب کے لیے بھی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ جنگ کی قوت اس کے اندر کی اصلی آگ ہے، اور جب بھڑکا دی جاۓ، بھڑک سکتی ہے۔ ترکوں نے اپنے تمام زمانۂ حکومت میں سب سے بڑی سخت خطرناک غلطی (جس کے نتائج اب بھگت رہے ہیں) یہ کی کہ ہمیشہ اہل عرب کی طرف سے بے پروائی برتی۔ ان کو مٹایا اور ذلیل کیا، اور ان کو خلافت کا رقیب سمجھ کر کبھی ابھرنے اور قابل بننے کا موقع نہیں دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی اصلی کارفرما قوت محض صحراؤں

کی ریگ اور اونٹوں کے غولوں کے اندر محدود ہو کر رہ گئی، اور اہل عرب کو کوئی موقع اپنی قدیمی روایات عظیمہ کے زندہ کرنے کا نہیں ملا۔

جنگ طرابلس میں غازی انور بے کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس ترکوں کے سب سے بڑے شخص نے عربوں کے اندر ایک تحریک پیدا کر دی، اور ان کو موجودہ حالات سے باخبر کر دیا۔ پس آگ بھڑک اٹھی، اور غافل چونک اٹھے۔ اس میں نہ طمع زر کو دخل ہے اور نہ بیش قرار تنخواہوں کو۔ پس اور آج کل کے دور مصائب میں یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ اسلام کے مستقبل قریب کو اگر پُر امید بننا ہے، تو یقیناً اس میں اسلام کے اصلی خزانۂ قوت یعنی عربوں کی زندگی اور تحریک کو دخل غالب ہوگا: وما ذالك على الله بعزیز۔

یہ ضرور ہے کہ طرابلس کی جنگ ترکوں اور اطالیوں کی جنگ تھی اور انگلستان کے باشندوں کے لیے سیاسی اور قومی جذبات کے لحاظ سے اٹلی کے اندر کوئی بڑی کشش نہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ اس زمانے میں بڑے بڑے انگریزی اخبارات نے اس حملے کو قابل اعتراض بتلایا اور بعضوں نے تو بہت سخت مضامین لکھے۔ پس حق پسند انگریزوں کے لیے اظہار حق کی یہ کوئی بڑی آزمائش نہ تھی۔ برخلاف اس کے موجودہ جنگ بلقان جو مسیحی جہاد کے نام سے کی گئی ہے، اور جو یورپ کو اسلام سے خالی کر دینے کے صلیبی ولولے پر مبنی ہے، انگلستان کے باشندوں کے لیے ادعاے حق پرستی و مظلوم نوازی کا اصلی امتحان تھا اور دیکھنا تھا کہ مسٹر بنیٹ، مسٹر میکالا، اور مسٹر ایبٹ وغیرہ کی طرح، کتنے ارباب حق پرستی ہیں، جو صداے انصاف بلند کرتے ہیں؛

بیشک اس ہنگامۂ قتل و غارت میں چند پست آوازیں رحم و انصاف کی بھی کبھی کبھی سننے میں آئی ہیں۔ فرانس کے مشہور انشا پرداز (بیر لوتی) کے مضامین ایک اچھی ضخامت کا رسالہ بن گئے ہیں۔ لیکن وہ تو ترکوں کی حمایت، اور ترکی سوسائٹی کے ایک محب ناول نویس ہونے کی حیثیت سے بدنام ہے، اور پھر افسوس کہ ان صداؤں میں سات کروڑ مسلمانوں پر حکمرانی کرنے والی قوم کا کوئی حصہ نہیں، والشاذ کالمعدوم!

اصل یہ ہے کہ انگلستان بدبختانہ اس وقت صلیبی جذبات کا شکار ہو گیا ہے، اور

یہ جذبہ اقلام وصحائف پر اس طرح حاوی ہے کہ ہمارے لیے انصاف و رحم کی صدا آب دریائے ٹیمس کے کنارے نہیں اٹھ سکتی۔

اٹلی کے قزاقانہ حملہ طرابلس کی تاریخ میں بھی (موجودہ جنگ کی طرح) انگلستان کا نام پہلے صفحہ میں لیا جائے گا۔

مسئلہ مصر و عرب کے لیے ایسا ہونا ضروری تھا اور گو اس کی طرف عملی پیش قدمی کا طرۂ افتخار سر ایڈورڈ گرے کی کلاہ سیاست کو حاصل ہو، لیکن سچ یہ ہے کہ انگلستان کی وزارت خارجیہ میں ان سے پہلے ہی یہ مسئلہ اپنے ابتدائی مرحلے سے گذر چکا تھا اور جس وقت فرانس نے ٹیونس اور الجزائر پر قبضہ کیا ہے، اسی وقت اٹلی کے وزیر خارجی (کرسپی) نے لارڈ (سالسبری) سے مراسلات شروع کر دی تھی۔ لارڈ سالسبری نے اس موقع پر اپنے سفیر کے ذریعہ جو امید بخش اور جرأت پرور جواب دیا تھا، اس کو مسٹر (بینٹ) نے دیباچہ کتاب میں نقل کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:-

"آپ کی تحریر کا لارڈ سالسبری پر بہت اثر ہوا۔ انھوں نے مجھے مندرجۂ ذیل مضمون کا تار دینے کی ہدایت کی ہے۔" ان کو اس امر سے اتفاق ہے کہ جب بحر روم (میڈیٹرینین) کی موجودہ بین الاقوامی حالات میں معمولی یا اہم تبدیلی کا وقت آئے گا، تو اس موقع پر یہ امر ناگزیر ہوگا کہ اٹلی طرابلس پر قبضہ کرلے۔" ایک بات میں سالسبری کو آپ سے البتہ اتفاق نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ طرابلس پر قبضہ کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ لارڈ سالسبری نے اپنی رائے ذیل کے جملہ پر ختم کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "گورنمنٹ ایطالیہ کو طرابلس مل جائے گا، لیکن ایک شکاری کو، جو چاہتا ہے کہ ہرن کو مار کر شکار کرلے، اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے، جب تک کہ اس کا شکار بندوق کی زد پر نہ آجائے، تاکہ اگر نشانہ پورا نہ پڑے اور خالی زخم آجائے، جب بھی گرفتار ہو جائے۔"

اس کے بعد مسٹر بینٹ لکھتے ہیں:-

"دول یورپ کو جس میں انگلستان بھی شامل ہے، اٹلی کی قزاقی کے ارادوں سے واقفیت تھی اور انھوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ ان ارادوں کے پورا کرنے میں شہہ دی۔ ہمارے یہاں خارجیہ تعلقات کی یہ حالت ہے کہ جس طرح ملک شام کے کاشتکاروں کو باب عالی کے معاملات میں کوئی دخل نہیں، اسی طرح عوام انگریزوں کا اپنے محکمۂ خارجیہ پر بھی کوئی اثر نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ ایسا واقعہ کبھی دل خوش کن نہیں ہو سکتا، جسے ہمارے ملک کے ۹۰ فی صدی باشندے نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں اور جسے بین الاقوامی ڈاکہ کہنا نہایت موزوں ہوگا اور اس پر طرہ یہ کہ ہمارا محکمۂ خارجیہ بلا کسی خفیف مخالفت کے ایسے علانیہ ڈاکہ کو جائز رکھے، درحالیکہ ملک میں لبرل پارٹی کی گورنمنٹ ہو۔ آخر میں کیوٗر[1] کے قول کو ماننا پڑتا ہے کہ "ہم سلطنت کے لیے وہ کام کرتے ہیں اور وہ تدابیر عمل میں لاتے ہیں جو اپنی ذات کے واسطے خواب میں بھی خیال نہیں کر سکتے۔"

اس کے بعد انھوں نے دول یورپ کے معاہدوں اور سیاسی اعلانات کی نسبت کیا خوب لکھا ہے:۔

"میں زمانۂ حال کے معاہدات کے متعلق بحث کرنا نہیں چاہتا کیوں کہ اس زمانہ میں عہد و پیمان صرف اس لیے لکھے جاتے ہیں کہ جس وقت ان کی وجہ سے کسی فریق کو تکلیف پہونچنے لگے تو فوراً چاک کر ڈالے جائیں، بشرطیکہ وہ فریق اس قدر قوت رکھتا ہو کہ بلا خرخشہ اپنے عہد کو توڑ سکے۔"

یہ کتاب جب شایع ہوئی ہے، تو اس کا تذکرہ اخبارات میں کافی ہو چکا ہے، اس لیے ہم زیادہ بحث کرنا نہیں چاہیے، ورنہ اس کے اکثر مقامات مستحق اقتباس و استدلال ہیں۔

(الہلال: ۲۳ اپریل ۱۹۱۳ء)

---

[1] ایطالیہ کا ایک مشہور عالم جو معاملات سیاست میں بہت قابل مانا جاتا تھا۔

کارزار طرابلس

قیمت ۱- روپیہ۔ درجہ اول با تصویر ۲- روپیہ۔ مترجم سے مل سکتی ہے۔

یہ کتاب اسی سیاحت نامہ کا اردو ترجمہ ہے۔ مترجم مسٹر عبداللہ خاں رئیس خورجہ ہیں۔ چھپائی صاف، کاغذ اچھا لگایا ہے۔ درجۂ اول کے ساتھ ناموروان غزوہ طرابلس اور اشخاص متذکرہ کتاب کی متعدد ہاف ٹون تصویریں بھی لگائی ہیں، جن سے کتاب کی دلچسپی میں عمدہ اضافہ ہو گیا ہے۔

مسٹر عبداللہ خاں دیباچے میں لکھتے ہیں کہ یہ ان کی پہلی ادبی کوشش ہے، اور ترجمہ نہایت عجلت میں کیا گیا ہے تاہم ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔ البتہ سرسری نظر میں بعض مقامات گنجلک، اور بعض موقعوں میں عبارت کی خامی، اور محاورات کی غلطیاں بکثرت ہیں۔

(الہلال، ۲۳ اپریل ۱۹۱۳ء)

محاربات طرابلس

قیمت ۱ روپیہ ۸ آنہ : انجمن ہلال احمر لکھنؤ

یہ اسی کتاب کا دوسرا اردو ترجمہ ہے، جو انجمن ہلال احمر لکھنؤ کی فرمائش سے جناب شیخ شوکت علی صاحب بی۔ اے نے بعد حصول اجازت مصنف کیا ہے، اور نوالکشوری پریس میں چھپا ہے۔ کاغذ اچھا ہے، اور چھپائی متوسط درجے کی ہے۔

ہم نے مثل پہلے ترجمے کے چند صفحات ایک دو مقام سے دیکھے۔ ترجمہ صاف اور سلیس اور عبارت بہت رواں اور بامحاورہ ہے، البتہ بعض بعض ترکیبوں اور علی الخصوص انگریزی ترکیبوں کا ترجمہ بہت رکیک اور غلط ہے۔ مثلاً جابجا "ڈاکہ زنی" کی ترکیب نظر آئی جو کسی طرح صحیح نہیں، اور صدہا فارسی تراکیب صحیحہ اس کی جگہ مل سکتی ہیں۔

اس کی فروخت سے جس قدر رقم بچے گی، وہ انجمن ہلال احمر کے فنڈ میں شامل کردی جائے گی۔ اس بنا پر فیاض طبع مترجم یقیناً مستحق تعریف ہیں۔

افسوس کہ ترجمے کے ساتھ تصاویر کا انتظام نہیں کیا گیا۔ البتہ دو نقشے افریقہ و مقامات جنگ کے علحدہ چھاپ کر لگادیے ہیں اور یہ بہت ضروری تھے۔

(الہلال: ۲۳ اپریل ۱۹۱۳ء)

جہنم سے پہلا اور دوسرا خط

قیمت حصہ اول ۲۔آنہ حصہ دوم ۲۔آنہ مترجم سے ریاست رام پور ممالک متحدہ کے پتے پر مل سکتی ہے۔

مولوی شرف الدین احمد خاں صاحب ہیڈ کلرک جیل رام پور کے متعدد رسالے اردو میں شایع ہو چکے ہیں۔

آج کل ایسے لوگوں کی بڑی ضرورت ہے جو اپنے فرصت کے اوقات کو ادبی خدمات کے لیے وقف کر دیں، اور اپنی مقدور بھر جو کچھ لکھ پڑھ سکتے ہیں، اس سے دریغ نہ کریں۔

مولوی شرف الدین صاحب ایسے ہی بزرگوں میں سے ہیں۔ یہ رسائل انگریزی کی ایک مقبول وکثیر الاشاعت کتاب سے ترجمہ کیے گئے ہیں، جو خود بھی غالباً یورپ کی کسی دوسری زبان کا ترجمہ ہے۔ اس کے مصنف نے مذہبی احکام جزا و عقوبت کو پیش نظر رکھ کر، ان روحانی آلام و عذاب کا نقشہ کھینچنا چاہا ہے، جو دنیا کے تمام مذاہب میں "جہنم" کے نام سے بیان کیے گئے ہیں، اور اس کے قوت تخیل اور قدرت تعبیر، دونوں چیزوں سے کہ شاعری کے اجزائے اولی ہیں، پوری طرح سے کام لیا ہے۔

صورت بیان یہ ہے کہ ایک سخت گنہگار آدمی مرجاتا ہے اور جہنم کے عذابوں میں گرفتار ہو کر، وہاں سے خطوط لکھتا ہے۔ اصل کتاب میں ۲۵ خط ہیں، اور ابھی بطور نمونے کے مولوی صاحب نے دو خطوں کا ترجمہ شایع کیا ہے۔

اس کتاب کے لکھنے سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی طبیعت پر مذہبی عقائد اور احکام کے اثر کو قوی کیا جائے اور گناہوں سے بچنے، اور تعذیب معاد کے عقیدے سے متاثر ہونے کا ذریعہ ہو۔ ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔ اور اس طرح کی ادبی اور شاعرانہ تحریروں کے ترجمے کی مشکلات پر غالب آنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قیمت اس قدر ارزاں ہے کہ اگر ہر شخص ایک ایک نسخہ لے لے تو اسے کچھ بھی محسوس نہ ہوگا، لیکن اگر مطالعہ ایک لمحہ کے لیے بھی دل پر کام کر گیا تو یہ بھی بہت قیمتی ہے۔ ہم مولوی صاحب کے اس مقصد وقیع واہم کو قابل داد وتحسین سمجھتے ہیں، گو آج کل کے بہت سے مدعیان تنویر وفکر وعلو خیال کو اس مقصد پر ہنسی آئے۔

(الہلال: ۹ مئی سنہ ۱۹۱۳ء)

سالنامہ مدرسۂ صولتیہ مکہ معظمہ

مہتمم مدرسہ ۔ کیرانہ ضلع مظفر نگر کے پتے سے مل سکتی ہے۔

مدرسۂ صولتیہ مکہ معظمہ کا ذکر ہمیشہ ہوتا رہتا ہے، اور اخبار بیں اشخاص اس کے کاموں سے بے خبر نہیں ہیں۔ یہ اس کی تازہ ترین رپورٹ ہے جو مولانا محمد سعید صاحب مہتمم مدرسہ نے شایع کی ہے، اور علاوہ حالات مدرسہ کے، اپنے تمہیدی مضامین کے لحاظ سے بھی نہایت دلچسپ اور مفید اطلاعات پر مشتمل ہے۔

اس مدرسے کو قائم ہوے عرصہ ہو گیا۔ مکہ معظمہ میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک قدرتی مرکز ہے، اور وہاں کا ہر معمولی اور ادنیٰ کام بھی اور مقامات کے عظیم الشان کاموں سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وقت کی ضرورتوں، اور اصول کار و طریق عمل سے اغماض نہ کیا جائے۔

اس بنا پر مدرسۂ صولتیہ بھی ایک توجہ طلب کام ہے، جو قائم ہے، اور اپنی ابتدائی منازل سے گذر چکا ہے، اور اگر اس کی طرف توجہ کی جائے تو ایک مفید ترین کام بن سکتا ہے۔

میں کسی وقت اس کی نسبت تفصیلاً لکھوں گا۔

یہ رپورٹ نہایت عمدہ اور پر تکلف چھپی ہے، اور ۱۱۶ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ مدرسہ کی تفصیلی حالت، جدید دار التدریس کا قیام، سالانہ اجلاس کی روداد، وسائل اعانت کی تفصیل، اور اسی طرح کے ضروری بیانات پورے شرح و بسط سے درج کیے گئے ہیں۔

(الہلال: ۹ مئی ۱۹۱۳ء)

آسان تعلیم

قیمت ۲۔ آنہ مصنف سے مل سکتا ہے۔

اردو زبان کی ابتدائی تعلیم اور رسم الخط کا مسئلہ بھی ایک اہم اور توجہ طلب مسئلہ ہے۔ یہ رسالہ مولوی عبدالرحیم صاحب پنشنر سپرنٹنڈنٹ مال کلکٹری گیا نے اس غرض سے لکھا ہے کہ بچوں کی تعلیم کے لیے قاعدۂ بغدادی کے اصول پر اردو کی تعلیم کا بھی ایک قاعدۂ ابتدائی مرتب ہو جائے۔

اس میں ہجے کے اصول پر تمام تراکیب حروف کے اسباق بنائے ہیں، اور حرکت کا سبق علیحدہ ہے۔ ساتھ ہی مرکب جملے مشق کے لیے دیئے ہیں اور پھر اضافت وغیرہ کی مشق کرا کے چھوٹی چھوٹی عبارتیں بنائی ہیں، جن سے یقیناً بچوں کو بہت فائدہ ہوگا۔

(الہلال: ۹ مئی سنہ ۱۹۱۳ء)

تفہیم القواعد

قیمت ۳۔ آنہ مصنف سے مل سکتا ہے۔

یہ اردو کے صرف ونحو کا ایک نیا رسالہ ہے، جسے مولوی جلال الدین احمد صاحب جعفری زینبی ہڈ مولوی گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور نے مرتب کیا ہے۔

یہ صرف پہلا ابتدائی حصہ ہے۔ دوسرا حصہ اعلیٰ جماعتوں کے لیے اس کے بعد شایع کیا جائے گا۔

اردو زبان کی ترقی و اشاعت میں یہ بات ہمیشہ عجیب سمجھی جائے گی کہ ایک طرف تو علوم وفنون کی کتابیں اس میں لکھی جا رہی ہیں، اور دوسری طرف کوئی جامع لغت بلکہ مکمل صرف ونحو تک موجود نہیں ہے، اور بیسیوں صرفی ونحوی مسائل ہیں، جو اب تک غیر فیصل شدہ ہیں۔

اس سے بھی عجیب تر یہ، کہ سودا اور میر تقی میر سے زیادہ احسان اس پر ایک علم دوست انگریز (سر جان گلکرسٹ) کا ہے، جس نے سب سے پہلے اس کے قواعد کو منضبط کرایا اور یہ احسان ان احسانات عظیمہ کے علاوہ ہے، جو بہ حیثیت اس زبان کے رواج دہندہ ہونے اس میں (باغ وبہار) جیسی بے نظیر نثر کی کتابوں کے مرتب کرانے، اور اس کی موسسانہ سرپرستی کی وجہ سے ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

بورڈ آف اگزامنرس کلکتہ نے گذشتہ نصف صدی کے اندر صرف ونحو میں کتابیں لکھنے اور لکھوانے کی متعدد کوششیں کیں، اور اس سے باہر بھی ملک میں متعدد کتابیں لکھی گئیں، مگر سچ یہ ہے کہ اب تک کوئی جامع اور ہر طرح معتبر کتاب ملک کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

یہ تو اردو صرف ونحو کے تدوین فن کا حال ہے۔ اس کے بعد ابتدائی اور متوسط واعلیٰ درسی قواعد کا خانہ ہے، اور معیار نظر بلند کر کے دیکھیے تو وہ بھی خالی ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید انضباط ضروریات قواعد، وتسہیل بیان، وترتیب مندرجات کے لحاظ سے انگریزی میں نسبتاً اچھی قواعد کی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ گو اغلاط و لغزشیں ان میں بکثرت ہوں۔

اس سلسلے میں بہت سی کتابیں میں نے دیکھیں، اور "تفہیم القواعد" ایک مختصر رسالہ تازہ ہے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ اب تک جو قواعد لکھی گئیں، ان میں یا تو انگریزی گرامر کا اتباع بیجا کیا گیا، یا محض عربی کا، اس لیے میں ایک سادہ و آسان رسالہ مرتب کرتا ہوں جو بچوں کے دماغ پر ابتدا ہی سے بارگراں نہ ہو۔

میں نے اس کے چند ابتدائی صفحات دیکھے۔ اس میں شک نہیں کہ طریق بیان بہت سہل و آسان ہے۔ ترتیب و مسائل وہی عام اور معمولی، مگر ہر سبق کے ساتھ ہی مشق کی عبارت بھی دیدی ہے۔ تقریباً تمام ضروری اقسام و ابواب کو جمع کیا ہے، اور یہ کوشش ہر جگہ نظر آتی ہے کہ طریق تعلیم آسان اور سہل ہو۔

بہتر تھا کہ طریق سوال وجواب سے بھی کہیں کہیں کام لیا جاتا کہ درس مسائل وقواعد کے لیے یہ طریقہ بہت مفید ہے۔

نقشے بنا کر باہمی تعلقات و روابط وانشعاب ابواب کو سمجھانا بھی ایک عمدہ اصول تعلیم ہے، اور بہتر ہو اگر آئندہ اس کا خیال رکھا جائے۔

(الہلال: ۹ مئی ۱۹۱۳ء)

اتحاد المسلمین

علماء و مصلحین واعظین و ارباب صحایف و جرائد کے لیے مفت۔ مولوی عبید اللہ صاحب
بنگلہ نواب وقار نواز جنگ متصل مسجد خیرت آباد۔ حیدرآباد (دکن)۔

مولوی محمد احسن صاحب اکزکیٹو انجینئر نے یہ رسالہ اس لیے لکھا ہے تاکہ مسلمانوں کو فریضۂ قطعیہ زکوٰۃ کی ضرورت و اہمیت، و دلائل فرضیت سے باخبر کیا جائے، اور آمادہ کیا جائے کہ اس فرض کی طرف سے غفلت نہ کریں، اور مولوی ابوالبرکات محمد عبید اللہ صاحب نے اسی مقصد سے اسے شایع فرمایا ہے۔ فجزاہما اللہ تعالیٰ خیر الجزا، وزادنا اللہ وایاہما حمیۃ الاسلام
اس رسالے کی تقریب پر بہتر ہے کہ چند کلمات فریضۂ زکوٰۃ کی نسبت عرض کروں۔

فریضۂ زکوٰۃ

حکم زکوٰۃ ایک اعظم ترین فرائض مسلمین، و اہم ترین احکام شریعت حقّہ اسلامیہ میں سے ہے، اور اس کی فرضیت مثل فرضیت حج و صلوٰۃ و صیام، نصوص قطعیۂ شریعت، اور تعامل غیر منقطع اہل اسلام سے ثابت ہے، اور منجملہ ہمارے موجودہ مصائب عظیمہ کے ایک مصیبت کبریٰ یہ ہے کہ اس فرض کی طرف سے غفلت و تساہل بالعموم طاری و ساری، اور اس کے جمع و صرف کے لیے انتظام و اہتمام کے وسائل مفقود۔

ہم نے اپنے گھر کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں، اور دنیا کے دور دراز گوشوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ آج یورپ میں مختلف مدارج و طبقات کے تصادم، اور فقرا و عمال[1]

[1] آج کل عربی میں یورپ کی لیبر پارٹی کے لیے "حزب العمال" کا لفظ رائج ہے، اور مزدوروں کے لیے عمال ہی کا لفظ زیادہ تر لکھا جاتا ہے۔

کے افلاس و مصائب، اور دولت کی عدم تقسیم و مرکزیۃ[1] کی وجہ سے موجودہ ہیئت اجتماعیہ اور معیشت مدنیہ کی بنیادیں ہل رہی ہیں۔ اشتراکیت (سوشیالزم) کی اسی لیے پیدایش ہوئی اور فوضویہ (نہلزم) کے مہیب وجود کی تولید اسی کا نتیجہ ہے۔ کل کی بات ہے کہ انگلستان میں مسٹر لائڈ جارج نے امراؤ اشراف کے ٹیکس کا مسئلہ اٹھایا تھا، اور برطانیہ کے مزدوروں کی اصلاح حالت اور تقویۃ مالی کے مقصد نے ایک سخت ہنگامہ مچادیا تھا۔

یہ سب کچھ قوم کے مفلس حصے کی ضروریات کے پورا نہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے۔

جرمنی اور بعض حصص امریکا میں غربار و محتاجین کے لیے حکومت اور قوم کے مشترک فنڈ قائم کیے گئے ہیں۔

کوآپریٹو سوسائٹیاں اور زرعی اور دیہاتی بنکیں جو آج قائم کی جارہی ہیں، یہ بھی دراصل اسی ضرورت کا علاج ہے کہ قوم کے محتاج اور بے مایہ حصے کی اعانت کی جائے۔

لیکن اسلام نے اپنے ظہور کے ساتھ ہی ان مفاسد اجتماعیہ و مدنیہ کا علاج کر دیا تھا۔ فریضۂ زکوٰۃ کی بہت بڑی مصلحت یہی تھی کہ اس کے ذریعہ قوم کے مفلس و محتاج حصے کی ضروریات کا انتظام کیا جائے۔ نیز صدہا ملی احتیاجات مالیہ کے لیے ایک دائمی خزینہ (فنڈ) مہیا ہو جائے۔

اسلام نے ایک طرف سود کو حرام کیا، جو غریبوں اور محتاجوں کی زندگی کے لیے مہلک و سم قاتل تھا، اور جس کے ذریعے دولت مندوں کو ان پر ایک جابرانہ و ظالمانہ تسلط کا موقع مل جاتا تھا۔ دوسری طرف اس کے بدلے زکوٰۃ کو فرض کر دیا تاکہ جن احتیاجات کی وجہ سے غریب و محتاج طبقہ سود دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، وہ پیش ہی نہ آئیں۔

فی الحقیقت موجودہ زمانے کے وقت کے کاموں میں سے ایک اہم اور ضروری کام

---

[1] دولت کی "مرکزیۃ" یعنی دولت کا کسی ایک ہی جماعت اور سوسائٹی کے طبقے میں جمع ہو جانا، اور دیگر حصص و طبقات کا بالکل محروم رہنا۔ یہ حالت تمدن اور سوسائٹی کے لیے سخت ضرر رساں ہے۔ رومۃ الکبریٰ کے انقراض و تباہی کے اسباب اولیٰ میں سے ایک سبب یہ بھی تھا۔ اسلام کا قانون توریث اور تقسیم ورثہ اسی مصلحت حکیمانہ پر مبنی ہے۔

فریضۂ زکوٰۃ کی تعمیل، اور اس کے جمع و خرج کے انتظامات کی باقاعدہ تشکیل بھی ہے، اور اس عاجز کے بعض پیش نظر کاموں میں اس کی تحریک بھی داخل ہے: وکل امر مرہون باوقاتہا۔

دراصل یہ تمام مصیبتیں اس لیے ہیں کہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے سلسلۂ حقہ کا عملاً سدباب ہو گیا ہے۔ علما اپنے قدرتی فرائض کو بھلا چکے ہیں، اور دارالشفا کے طبیب خود ہی بیمار اور محتاج اطبا ہیں۔ ایسی حالت میں کس کس بات پر روئیے، اور کس کس کا ماتم کیجیے۔

تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم؟

مولوی صاحب کی یہ سعی مستحق ہزار تحسین ہے کہ امر بالمعروف و تبلیغ احکام شریعت میں مصروف ہیں۔ اس طرح کے رسائل و مطبوعات کی جس قدر اشاعت ہو، داخل عبادت، بل افضل از ہزار نافلہ و تہجد ہے۔

(الہلال: ۹ مئی ۱۹۱۳ء)

بعض حدیث الاشاعت

جرائد و مجلات (۱)

(آزاد)

کانپور۔ قیمت سالانہ ۳ روپیہ۔ ایڈیٹر مسٹر نگم بی۔ اے

رسالہ "زمانہ" کانپور اردو کے مشہور رسائل میں سے ہے۔ اسی کے دفتر سے یہ ہفتہ وار اخبار جاری ہوا ہے۔

صوبجات متحدہ میں بمقابلہ پنجاب کے اخبارات کم ہیں۔ اور عمدہ اخبارات کی جگہ ہر صوبے میں ابھی بہت کچھ خالی ہے۔

مسٹر نگم ایک مقبول رسالے کے ایڈیٹر ہیں، اس لیے پبلک کے لیے ان کے اخبار کا مطالعہ پہلا تجربہ نہیں ہے۔ اس وقت تک میں نے ایک دو نمبر جو اس کے دیکھے، تو خبروں کے جمع کرنے، وقت کے معاملات پر بحث کرنے، اور حتی المقدور ہر طرح کی دلچسپی کا سامان مہیا کرنے میں ساعی پایا۔ ضخامت بھی پنجاب کے بعض اخبارات کی طرح غیر معمولی ہے، اور چھپائی لکھائی عام حالت کے لحاظ سے بری نہیں۔ پولیٹکل امور میں شاید اس نے اپنی پالیسی "ہندوستانی" لکھنؤ کی مثال دے کر واضح کی ہے، اور میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ ہندوستانی کی پالیسی بہت مفید، معتدل، اور اتحاد و تالیف حکام کے ساتھ، مصالح ملکی کے تحفظ کے اصول پر، بہت اچھی ہے۔

البتہ اعتدال کے معنی درمیانی راہ اور توسط کے ہیں۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان دونوں

ع۱ ماہوار رسائل کے لیے شام کے مشہور ادیب شیخ خلیل یازجی نے "مجلہ" کا لفظ منتخب کیا، اور تمام ملک نے قبول کر لیا یہ کوئی نئی اصلاح نہیں ہے، بلکہ جاہلیت عرب کی زبان میں بھی قریب قریب اسی مفہوم کے لیے بولا جاتا تھا۔ (منہ)

راہوں میں سے کسی ایک راہ سے اس قدر قریب تر ہو جائے، کہ اگر بال برابر اور بڑھے تو درمیانی حصے کی جگہ، سرحد کو عبور کر جائے۔

اردو پریس کے لیے ایک مشورہ

"آزاد" کے ذکر میں نئے اخبارات کا ذکر آگیا ہے تو ہم اپنے چند خیالات بطور مشورے کے ظاہر کر دینا چاہتے ہیں۔

نئے اخبارات جو نکلے ہیں، یا شایع ہونے والے ہیں، بہتر ہے کہ ان میں مندرجۂ ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے:

(۱) یورپ میں روزانہ، ہفتہ وار جرنل، ماہوار اور سہ ماہہ کی جو ترتیب اور مضامین و مقاصد کی تقسیم ہے، اس کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ ایک وقت تھا کہ ملک میں اخبار بینی کا مذاق بہت کم تھا، اس لیے تقسیم عمل اس بارے میں ممکن نہ تھا، اور ضرورت اس کی تھی کہ جیسے کچھ ہوں، مگر اخبارات نکالدیے جائیں، مگر اب حالت بدل چکی ہے، پس ضرور ہے کہ رفتہ رفتہ اردو پریس کو صحیح اصول تقسیم کار، اور ترتیب و نظام عمل پر لایا جائے، اور یہ طوائف الملوکی اور بے راہ روی نہ ہو کہ ہفتہ وار اخبار، روزانہ اخبارات کا مواد فراہم کر رہے ہیں، اور ہفتہ وار ماہوار رسائل کے سے مضامین کی تلاش میں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ایک صنف بھی موجود نہیں۔ نہ روزانہ، روزانہ ہیں، نہ ہفتہ وار، ہفتہ وار۔

(۲) تصاویر اور کارٹون عمدہ اجزاء اخبار و رسائل میں سے ہیں، اور موجب ازدیاد اثر و رونق اخبار، و وسیلۂ حسن تفہیم و تسہیل مطالب و مسائل، لیکن کسی کام کے کرنے کے لیے اسے کر دینا ہی شرط نہیں ہے، بلکہ اس طرح کرنا، جس طرح دنیا میں کیا جاتا ہے۔ لیتھو کی چھپائی میں تصاویر کا انتظام ممکن نہیں اور اگر ممکن ہے تو اس قدر اعلیٰ درجہ کا کام، جس کے مصارف کا تحمل ممکن نہیں۔ پھر اس سے کیا فائدہ کہ چند سیاہی کے دھبوں سے صفحات سیاہ کر کے مذاق سلیم و حسن نظر کو زخمی کیا جائے؟

البتہ کارٹون ممکن ہیں، لیکن یاد رہے کہ آج کل کارٹونوں کو وضع کرنا، اور پھر ان کو بنانا ایک مستقل فن لطیف و دقیق ہے، جس کے یورپ میں خاص خاص ماہرین فن ہوتے

ہیں، اور ان پر ہزار ہا روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے دقتِ خیال، نزاکت تخیّل، سرعت فہم، مواد شاعری، اور قوت مصوری کے ایک ہی دماغ میں جمع ہونے کی ضرورت ہے۔ پھر ایسے قابل مصوروں کی، جن کے سامنے کارٹون کے تمام اجزا لفظوں میں پیش کر دیے جائیں، اور وہ اس طرح انھیں جامۂ تصویر پہنا دیں، گویا اس کے سوا اور کوئی لباس ان کے لیے موزوں ہی نہ تھا۔

مجھ کو خود بارہا کارٹون کا خیال ہوا، اور کئی بار بعض لطیف و نازک خاکے ذہن میں آئے۔ اس کا سامان بھی اور تمام مقامات سے بہتر موجود تھا، مگر میں نے بہتر نہ سمجھا کہ کسی کام کو کیا جائے، اور ایک صاحب فن کی حیثیت سے نہ کیا جائے۔

پس اردو اخبارات یا تو کارٹون کا صیغہ بالکل چھوڑ دیں، یا اس کی ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھیں۔ یہ محض تمسخر نہیں ہے، بلکہ موجودہ ترقی یافتہ پریس کا ایک وقیع اور اہم کام ہے۔

(الہلال: ۹ مئی ۱۹۱۳ء)

مساوات

الہ آباد۔ قیمت سالانہ ۴ ۔ روپیہ ۔ اڈیٹر: مسٹر نذیر احمد (علیگ)

یہ اخبار حال میں شایع ہوا ہے۔ صوبجات متحدہ میں اب تک علی گڈھ گزٹ، اور البشیر وغیرہ کے سوا مسلمانوں کے ہاتھ میں باوقعت اخبارات بالکل نہ تھے۔ پچھلے دنوں لکھنؤ سے مسلم گزٹ نکلا، اور اب خوشی کی بات ہے کہ اس طرف تعلیم یافتہ اصحاب کو توجہ ہونے لگی ہے۔ چنانچہ "مساوات" اسی سلسلے میں قابل ذکر ہے۔

اس کا ایک پرچہ ریویو کی غرض سے میں نے اٹھالیا ہے۔ ضخامت ۱۶ صفحہ کی ہے، جو کافی ہے۔ کاغذ عمدہ لگایا جاتا ہے، اور شاید اس لیے اپنے صوبے کے تمام اخبارات میں ممتاز ہے۔ خبروں کے انتخاب، اور اہم واقعات اور کونسل کے ضروری مباحث وغیرہ کے تراجم و تذکرے کا بالعموم اہتمام کیا جاتا ہے۔

صوبجات متحدہ میں ابھی اردو اخبارات کی بہت کمی ہے، اور پبلک میں روز بروز اخبار بینی کا مذاق بڑھتا جاتا ہے۔ اس لیے نئے اخبارات جس قدر شایع ہوں بہتر ہے۔ امید ہے کہ الہ آباد کے اس تنہا اردو اخبار کو، جو صوبے کے دارالحکومت سے نکلا ہے، ترقی و کامیابی کے وسائل بہت جلد حاصل ہو جائیں گے۔

قیمت اگر صرف ۳۔ روپیہ کر دی جائے تو بہتر ہوگا، کیونکہ مسلم گزٹ اور آزاد وغیرہ نے انتہائی قیمت یہی رکھی ہے اس طرح اشاعت میں بھی بہت جلد ترقی ہو جائے گی۔

(الہلال: ۹ مئی ۱۹۱۳ء)

نقاد

آگرہ۔ قیمت سالانہ ۳۔ روپیہ۔ اڈیٹر سید نظام الدین شاہ دلگیر۔

ایک نیا ماہوار ادبی رسالہ ہے۔ ضخامت ۵۴ صفحہ ہے۔ کاغذ متوسط درجہ کا۔ چھپائی آگرہ کی مشہور ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ پرچہ مقبول ہوگا، کیوں کہ آج کل کے اخبار و رسائل کے اہلِ قلم اس میں ابتدا سے مضامین لکھتے، اور اس کی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ آگرہ جو نی الحقیقت عہد اسلامی کے دورِ عروج کا دارالخلافہ، اور اردو کی ترقی اور نشو و نما میں بھی ایک حصۂ وافر رکھنے والا، نیز میرؔ و غالبؔ کا مولد ہے، ضروری ہے کہ اُردو رسائل کی پیدائش اور نشو و نما کے لیے بھی اچھا وطن ثابت ہو۔

جدید رسائل کے لیے چند مشورے

چند باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

(۱) موجودہ وقت صرف اس لیے ہے کہ کام کیا جائے۔ ہر شعبے میں صرف اسی کی ضرورت ہے۔ پس مختلف عنوانوں پر چند مضامین کا اکٹھا کر دینا، گو ایک رسالے کی تشکیل صوری کے لیے کافی ہو، مگر معناً کافی نہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ آج کل نئے رسالے جو شایع ہوں، وہ علاوہ جمع مضامین و تحشیۂ مولفانہ کے کوئی خاص مقصد بھی اپنے سامنے رکھتے ہوں۔ اردو زبان کی نظم و نثر میں ابھی کام کے تمام گوشے خالی ہیں۔

(۲) پبلک کا مذاق ارباب صحائف و رسائل کے رحم کا طالب ہیں۔ اب کچھ نہ کچھ اردو پریس کی سطح بلند ہونی چاہیے۔ پیشتر سے جو رسالے نکل رہے ہیں، ان کی محض تقلید کچھ بلند نظری کی بات نہیں۔ ہر شخص کو اپنے کاموں کے لیے کوئی نئی بلندی ڈھونڈنی چاہیے۔ سطحی

اور بدمذاق مضامین کی اشاعت سے خود ارباب قلم کے سامنے پست نمونے پیش ہوتے ہیں۔ اور پبلک کا ذوق سلیم زخمی ہوتا ہے۔ رسالوں کی ضخامت نصف کر دی جائے تو حرج نہیں لیکن ہر طرح کے رطب و یابس سے کیا فائدہ؟

(۳) نقاد کا صرف نمبر ۴ میں نے دیکھا۔ اس میں ایک مضمون "ریڈیم" کے عنوان سے درج ہے، اور اس کے نیچے ایڈیٹر الہلال کا نام ہے، حالانکہ میں نے نقاد کے لیے کوئی مضمون نہیں لکھا، بلکہ اس کی اشاعت کی بھی خبر نہ تھی۔ دراصل وہ مضمون الہلال میں شائع ہوا ہے، اور اسی سے نقل کر لیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ایڈیٹر کے نام کی جگہ الہلال کا نام درج کرنا تھا۔ اس کو محدثین اپنی اصطلاح میں تدلیس کہتے ہیں، اور افسوس کہ اس کی مختلف اشکال آج کل عالم گیر ہیں۔

بعض لوگ ہمیشہ فریاد کرتے رہتے ہیں کہ ان کے اخبارات سے مضامین بغیر حوالہ نقل کر لیے جاتے ہیں۔ مگر میں تو اس فریاد کو تمسخر انگیز سمجھتا ہوں۔ آج تک بیسیوں اخبارات نے بغیر حوالہ مضامین الہلال سے نقل کیے، مگر میں بجائے معترض ہونے کے خوش ہوا۔ کیوں کہ اصل شے خیالات کی اشاعت ہے۔ پس اگر بغیر حوالہ محض نقل کر لیا جائے تو چنداں شکایت نہیں۔ لیکن یہ تو نہ کیجیے کہ مضمون نقل کیا جائے اخبار سے، اور پبلک کو یقین یہ دلایا جائے کہ اس کے اڈیٹر نے خاص طور سے رسالے کے لیے لکھا ہے۔

(۴) آج کل یہ عادت بھی عام ہے کہ لوگ کوئی کتاب لکھتے یا رسالہ نکالتے ہیں، اور پھر اس کی نسبت ہر قلم و سیاہی سے کام لینے والا جو کچھ لکھ دیتا ہے، کمال فخر و مباہات کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے، اور بعض اخبار و رسائل میں تو اس کے مستقل باب رکھے جاتے ہیں۔

لیکن میرے خیال میں یہ ایک بہت ہی چھوٹے درجے کی بات ہے، اور اس سے انسان کی ہمت، اور منتہائے فکر کا پیمانہ بہت ادنیٰ ثابت ہوتا ہے۔ اول تو اصولاً اصل شے کام کی خوبی ہے، اور کوئی تعریف خواہ کیسی ہی بڑے سے بڑے قلم سے نکلی ہو، اس پر اضافہ نہیں کر سکتی۔ پھر یہ کون سی خوشی کی بات ہوئی کہ فلاں اخبار والے نے آپ کی تعریف کر دی، اور فلاں اڈیٹر نے کہہ دیا کہ بہت اچھا اور دلچسپ ہے؟ شاید حسب ملک میں مستند اقلام و افکار، نقد و تقریظ

کا فرض انجام دیتے ہوں، وہاں ان کا نقل کرنا موزوں (اور وہ بھی تجارتی اغراض والوں کے لیے) مگر ابھی اردو پریس کے لیے تو یہ وقت نہیں آیا۔

اپنی ہمتوں کو بلند کرو۔ لوگوں کی تعریف و ستایش سے ہماری سطح فکر کو بلند تر ہونا چاہیے۔ یہ دماغ کا افلاس ہے کہ وہ دوسرے دماغوں کے دستر خوان پر اپنے لیے غذا ڈھونڈھے۔ پھر وہ کون لوگ ہیں، جن کی تعریف و ستایش پر "فخر و مباہات" کے الفاظ کا اسراف بیجا کرتے ہوئے؟

المؤید، الجریدہ، الزہرہ، اتحاد و ترقی، البرہان، المنار، الہلال قاہرہ، چہرہ نما، شہبال، تصویر افکار، اسلام، وغیرہ وغیرہ ممالک اسلامیہ کے جرائد و رسائل نے الہلال کی نسبت جو کچھ لکھا ہے، میں نے تو اس کا بھی کبھی ذکر نہیں کیا۔

سینکڑوں ضروری خطوط اخبار میں اس لیے نہیں شایع کرتا کہ ان میں جس طریقے سے مجھے مخاطب کیا جاتا ہے، اور شخصی طور پر بحث کی جاتی ہے، اس کا میں اہل نہیں۔

(الہلال: ۲۴ مئی ۱۹۱۳ء)

توحید

چھاؤنی میرٹھ۔ قیمت سالانہ۔ ۳۔ روپیہ۔ اڈیٹر خواجہ حسن نظامی دہلوی

خواجہ صاحب کے مضامین نہایت کثرت سے مختلف اخبارات و رسائل میں نکلتے رہے ہیں، اس لیے مزید تقریب کی ضرورت نہیں۔

یہ اخبار حال میں میرٹھ سے شایع ہوا ہے، اور بہترین نام ہے۔ جو اختیار کیا گیا ہے۔ کاغذ نہایت اچھا۔ ڈیمائی سائز کی پوری نصف تقطیع پر نکلتا ہے، اور لکھائی چھپائی اتنی اچھی ہے جو ہفتہ وار اخبارات میں کم دیکھی گئی ہے۔ ان حالات کے ساتھ قیمت یقیناً ارزاں ہے۔

میرٹھ ایک ممتاز شہر ہے۔ وہاں سے آج کل کوئی اخبار نہیں نکلتا تھا۔ یہ بہت ضروری ہے کہ کم از کم ہر شہر سے اک دو اردو کے اخبار جاری ہوں۔

امید ہے کہ اس نئے اخبار کو ترقی و ثبات کے وسائل بہت جلد حاصل ہو جائیں گے۔

(الہلال: ۱۴ر مئی ۱۹۱۳ء)

ہمدرد دہلی

بالآخر روزانہ "ہمدرد" اپنی پوری ضخامت اور ترتیب مضامین کے ساتھ شایع ہوگیا۔

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ!

اس وقت تک ۴۷۔ نمبر نکل چکے ہیں۔ ۸ صفحہ کی ضخامت ہے، اور ڈمائی سائز کی چوتھائی ایک متوسط تقطیع ہے، جو پیشتر سے روزانہ اُردو اخبارات کی قرار پا چکی ہے۔ ٹائپ بیروت کا ہے، جس کو اس نگار خانے کا اصلی حسن سمجھنا چاہیے۔ کاغذ بھی اب بدل دیا گیا ہے، اور دبیز اور چکنا لگایا جاتا ہے۔ ایسا کاغذ روزانہ اخبارات کے لیے ضروری نہیں، اور اس لیے یہ ایک مزید اور غیر معمولی اہتمام ہے۔

جو چیز جتنے زیادہ انتظار کے بعد ملے، اتنی ہی زیادہ محبوب بھی ہوتی ہے۔ تلاش مطلوب میں آپ جس قدر زیادہ سرگرداں رہیں گے اتنا ہی زیادہ اس کا حصول مسرت بخش بھی ہوگا۔

ہمدرد کی اشاعت میں تاخیر کے عجیب عجیب اسباب پیدا ہوتے رہے۔ ٹائپ کے مسئلے نے امیدوں کو مایوسیوں سے بدل دیا۔

کہ عشق آساں نمود اول، ولے افتاد مشکلہا

پبلک کو انتظار کی تکلیف تھی، اور کام کرنے والوں کو تلاش مقصود میں سرگردانی۔ اس کا انتظار بھی شدید تھا، اور اس کی تلاش کی سختیاں بھی کم نہ تھیں۔ بس ان مشکلات کے بعد جو چیز میسر آئے، کیوں نہ اس کا میسر آنا مطبوع و مسرت بخش ہو؟

اردو پریس پر نصف صدی گذر گئی، لیکن اب تک وہ اپنے دور طفولیت سے آگے نہیں بڑھا۔ یہ میدان اب تک بالکل خالی ہے۔ بہت سے عظیم الشان کام ہیں جو کام کرنے والوں کو یہاں انجام دینے ہیں۔ یورپ کے فن صحافت سے قطع نظر کیجیے۔ ٹرکی اور مصر کے روزانہ اخبارات ہی

کو سامنے لائیے تو خود اپنی نظروں میں آپ حقیر معلوم ہوں گے۔ مگر پریس کی اصلی قوت روزانہ اخبارات ہیں، اور وہی اردو میں کالمعدوم۔

ہمیں ورق کہ سیہ گشتہ، مدعا اینجاست

پس یہ ایک نہایت مبارک آغاز ہے جو "ہمدرد" کی صورت میں ہوا ہے۔ اس طرح کے وسیع انتظامات سے اب پبلک آشنا ہوتی جاتی ہے، اور اخبار بیں طبقہ موجودہ حالت پر قانع نہیں۔ سب سے بڑا لاینحل مسئلہ ٹائپ کا مسئلہ تھا۔ لوگ اس کا نام لیتے ہوئے ڈرتے تھے کہ نہیں معلوم کیسی گذرے گی؟ لیکن اب عوام و خواص میں ہزاروں اشخاص ہیں جو ٹائپ کے مطبوعہ صفحات پڑھتے ہیں اور شوق و ذوق سے پڑھتے ہیں۔ حتیٰ کہ تعلیم آشنا مستورات اور خواتین بھی جو درسی کتب میں صرف نستعلیق ہی کی عادی ہیں، بلا تکلف ٹائپ کے اخبار منگاتی ہیں۔ ایک سال کے اندر اردو پریس کا یہ تغیر عظیم الشان اور غیر متوقع ہے۔

"ہمدرد" کے پہلے پرچے کا سر آغاز ڈاکٹر اقبال کی ایک موثر نظم تھی، جس میں انھوں نے ایک عرب مجاہد لڑکی کی شہادت کا واقعہ نظم کیا ہے۔ قارئین الہلال کو یاد ہوگا کہ گذشتہ نومبر میں بسلسلۂ "ناموران غزوۂ طرابلس" ایک مضمون "الاحیاء الذین لا یموتون" کے عنوان سے الہلال میں چھپا تھا، اور اس میں "فاطمہ بنت عبداللہ" نامی ایک یازدہ سالہ مجاہدۂ غیور عربیہ کے حالات شہادت مع اس کے مرقع خونیں کے شایع کیے گیے تھے۔ اسی واقعہ کو ڈاکٹر اقبال نے اس نظم میں درج کیا ہے۔ یہ، اور اسی طرح کے بعض زہرہ گداز و عظیم الاثر حالات جو الہلال میں لکھے گیے ہیں؛ ان کے متعلق احباب کرام کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے ذرایع علم اس درجہ نادر اور غیر معمولی ہیں کہ مصر و شام کے عربی اخبارات کا بھی ان پر دسترس نہیں۔ چنانچہ "فاطمہ بنت عبداللہ" رضی اللہ عنہا کا واقعۂ شہادت مصر کے تمام مشہور و غیر مشہور جرائد میں سے کسی اخبار کو بھی نصیب نہ ہوا۔ ترکی میں بھی صرف ایک ماہوار رسالے کو یہ حالات معلوم ہوئے تھے۔

اسی طرح اب انشاءاللہ "ناموران غزوۂ بلقان" کا سلسلہ بھی الہلال میں جاری رہے گا۔

بہر حال "ہمدرد" کی اشاعت پر ہم دفتر کامریڈ کو مبارکباد دیتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں کہ ان کو مہلت ملے، تاکہ وہ اس ابتدائی نمونے کو حد تکمیل تک پہنچا سکیں۔

اس اہتمام اور صرف کثیر کے ساتھ اس کی سالانہ قیمت صرف ۱۵- روپیہ ہے۔ اور ششماہی ۷- روپیہ آٹھ آنہ۔ امید ہے کہ لوگ اس کی قدردانی کر کے، کام کرنے والوں کی قدر افزائی کی ایک عمدہ مثال قائم کریں گے۔

(الہلال: ۱۶ جولائی ۱۹۱۳ء)

رسالہ خطباتُ الاسلام

مصنفہ مولوی محمد یونس صاحب رئیس دناولی۔ علی گڈھ

مولوی صاحب نے اس میں جمعہ کے لیے بہ طور نمونے کے چند اردو خطبے مرتب کر کے جمع کیے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو مفید وقت و حال خطبات کی طرف مائل کیا جائے۔ اس رسالے کو دیکھ کر مجھے اصل مسئلہ خطبات مساجد جمعہ کا خیال آگیا جسے مدت سے لکھنا چاہتا ہوں اور انشاء اللہ لکھوں گا۔

جمعہ کا اجتماع اور حکم خطبہ مسلمانوں کے فلاح دارین کا وسیلۂ عظمیٰ تھا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ہفتے میں ایک بار لوگوں کو ان کی حالت اور ضرورت کے مطابق ہدایت و ارشاد کی دعوت دی جائے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک دائمی ذریعہ ہو۔

خطبہ دراصل ایک وعظ تھا جیسا کہ وعظ ہوتا ہے۔ آنحضرت (صلعم) کے بعد خلفائے راشدین اور صحابہ کا بھی یہی حال رہا اور تمام عربی حکومتیں جو اس کے بعد قائم ہوئیں ان میں بھی خلفا و سلاطین کو مساجد کے منبروں پر وعظ کرتے ہوئے تاریخ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ حقیقت خطبہ کے لیے کتب صحاح کے ابواب متعلق جمعہ و خطبہ کی احادیث دیکھنی چاہئیں۔

لیکن ہماری اصلی مصیبت ہمارے حالات میں نہیں ہے کہ وہ نتائج ہیں۔ اس کا اصلی منبع ہمارے اعمال کے تحریف و نسخ میں ہے کہ وہی علل و اسباب ہیں۔ شخصی حکومتوں کے قیام، عجمی سلاطین کی کثرت، سنت خلفاء راشدین کے ضیاع، اور جہل و غفلت کے استیلا نے ہر اسلامی عمل کو ایک لباس ظاہر دے کر اس کی روح حقیقت سلب کر لی ہے، خطبۂ جمعہ اور عیدین و نکاح کا بھی یہی حال ہے۔

اب خطبے کے معنی یہ رہ گئے ہیں کہ عربی زبان میں ایک چھپی ہوئی کتاب، جو بازار سے خریدلی جائے، اور الف لیلہ کی طرح اس میں سے ایک خطبہ غلط سلط پڑھ کر سنادیا جائے۔ آواز بہ شدت کریہہ ہو، اور لب و لہجہ میں عربیت پیدا کرنے کے لیے ہر جگہ تفخیم وثقالت سے کام لیا جائے۔ بعض لوگ قرآن شریف کی حاصل کردہ قرات کو اس میں بھی صرف کرتے ہیں، اور پھر جو شخص ہر لفظ کے آخری حرف کو پوری سانس میں کھینچ کر پڑھ دے وہ سب سے بڑا قاری ہے!!

بسا اوقات غریب پڑھنے والا بھی نہیں جانتا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں؟ الف لیلہ کی ایک رات کا افسانہ ہے، قلیوبی کی کوئی حکایت ہے، یا ارشاد و ہدایت امت کا وہ عظیم وجلیل عمل اقدس، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر کھڑے ہو کر مجھ کو انجام دینا پڑتا ہے؟ پھر سننے والوں کی مصیبت کا کیا پوچھنا؟ کوئی اونگھتا ہے، کوئی اپنے ساتھیوں سے صبح کے بازار کا بھاؤ پوچھتا ہے!

یہ تمسخر انگیز تذلیل و تحقیر ہے اس مذہب عظیم کے اعمال دینیہ کی، جس کے داعی اول نے اپنے خطبات و مواعظ سے ایک بادیہ نشین قوم کو روم و ایران کے تمدن کا مالک بنادیا تھا!

وما کان اللہ لیظلمھم، ولکن کانوا انفسھم یظلمون!!

یقین کرو کہ جب حضرت (مسیح) نے بنی اسرائیل کی ذات و ہلاکت پر ماتم کیا تو شریعت موسوی کے احکام و اعمال کا بعینہٖ یہی حال تھا۔ جو آج تم نے خدا کی شریعت کا بنا رکھا ہے۔ مسیح اگر ان فروسیوں اور صدوقیوں پر روتا تھا، جو گو بڑی بڑی آستینوں کے جبے پہنتے، ہر وقت دعائیں مانگتے، اور بڑی بڑی مہیب تسبیحیں اپنے ہاتھوں میں رکھتے تھے، پر شریعت کے حکموں کو انھوں نے مسخ اور اعمال صالحہ کو بے اثر کر دیا تھا، تو ہمیں بھی اپنے عالموں اور صوفیوں پر ماتم کرنا چاہیے جو ان کی طرح یہ سب کچھ کرتے ہیں پر انھیں کی طرح حقیقت سے بھی خالی ہیں!!

میں سرے سے اس امر ہی کا اعدعدو دشمن ہوں کہ خطبے لکھے ہوئے پڑھے جائیں۔ یہ ایک بدعت ہے جس کا نہ تو قرون مشہود لہا بالخیر میں ثبوت ملتا ہے اور نہ علت حکم اس

کا موید۔ خطبہ ایک وعظ ہے۔ پس مسجدوں میں ایسے خطیب ہونا چاہییں جن کو یہ قابلیت حاصل ہو کہ جمعہ کے خطبے کے لیے طیار ہو کر آئیں، اور زبانی مثل عام مواعظ کے وعظ کہیں۔ ضرور ہے کہ قوم کی موجودہ حالت ان کے پیش نظر ہو۔ جو بیماریاں آج ہمیں لاحق ہیں، انھیں کا علاج بتلائیں، نہ کہ ان کا، جو اب سے پانچ سو برس پہلے تھیں؟

جو خطبات عربیہ آج کل رائج ہیں، میں نے سب کو پڑھا ہے۔ وہ تو اس وقت کے لیے بھی موزوں نہ تھے، جس وقت کے لیے لکھے گئے تھے۔ پھر آج کل کی حالت کا کیا ذکر؟

خطبہ کا یہ مطلب کس نے بتلایا ہے کہ صرف جمعہ وعیدین کے چند مسائل بیان کر دیے جائیں اور کہہ دیا جائے کہ ایک دن مرنا ہے پس ڈرو اور موت کو یاد کرو؟ بیشک، موت کو یاد کرنے سے بڑھ کر انسان کے لیے دنیا میں کوئی نصیحت نہیں ہو سکتی۔ کفاک بالموت واعظاً یا عمر! لیکن صرف یہ کہہ دینا لوگوں کو ڈرانے کے لیے کافی نہیں ہے۔ موت کی یاد کے ساتھ ان کو اس زندگی کا طریقہ بھی تبلانا چاہیے جو تذکرۂ آخرت کے ساتھ مل کر، انسانوں کو دونوں جہانوں میں نجات دلا سکتی ہے۔

بڑا مسئلہ زبان کا ہے۔ اور ضرور ہے کہ ایک مختصر سے خطبۂ ماثورۂ عربیہ کے بعد، وعظ اسی زبان میں ہو، جو سامعین کی زبان ہے، ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے حاصل کیا؟

شریعت نے کیسی عمدہ مصلحت اس میں رکھی کہ جمعہ کے خطبے کو نماز فرض کا قائم مقام قرار دیا اور اس کی سماعت کو فرض تبلایا۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دونوں خطبوں کا سماع واجب ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک صرف پہلے کا۔ اس وقت نماز پڑھنا جائز نہیں۔

اس سے مقصود یہی تھا کہ لوگ عمل عبادت کی طرح نصائح وہدایت کو بھی سنیں۔ پھر ان نصائح کو ایسا اہم ہونا چاہیے کہ مصروفیت نماز سے بھی اقدم وانفع ہوں، کیا یہ خطبات جو آج کل دیے نہیں بلکہ اٹک اٹک کر پڑھے جاتے ہیں اور لوگ بیٹھے ہوئے اونگھتے ہیں، یہی وہ مواعظ ہیں، جن کی سماعت فرض، اور ان کی موجودگی میں نماز تک ممنوع ہے؟

خطبہ کے معنی تو یہ ہیں کہ نہ صرف عام حالت کی اس میں رعایت کی جائے، بلکہ

گذشتہ جمعہ کے بعد جو نئے حالات و حوادث دنیا میں گذرے ہیں اور ان کی بنا پر مسلمانوں کو جو کچھ تعلیم کرنا ضروری ہے، اس کے بھی رعایت اس میں ملحوظ رہے۔ ضرورت اس کی تھی کہ جنگ بلقان و طرابلس کا ذکر خطبوں میں ہوتا۔ مسجد کانپور کا جب حادثہ پیش آیا، تو اس کے بعد کے جمعہ میں ہر جگہ خطبار اس واقعہ کے متعلق بیان کرتے۔ مسلمانوں کی تعلیم، ان کی سیاسی حالت، ان کے اخلاق و اعمال، ان کی ضروریات حالیہ، اگر مساجد کی تعلیم سے درست نہ ہوں گی تو کیا وائی۔ ایم۔ سی کے پریچنگ ہالوں میں ان کو ڈھونڈھا جائے؟ اگر یہ سلسلہ درست ہو جائے تو پھر نہ انجمنوں کی ضرورت ہے، نہ کسی مرکزی کانفرنس کی لوکل کمیٹیوں کی، اور نہ مسلم لیگ کی شاخوں کی۔

میں نے ایک بار کہا تھا کہ میرے فکر و نظر اور آج کل کے ارباب عمل کے کاموں میں ایک بہت بڑا اصولی فرق یہ ہے کہ وہ راہ تاسیس اختیار کرتے ہیں، اور میں صرف تجدید و احیار کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ یہ بحث بھی اس کی ایک مثال ہے۔

اس کام کے لیے ضرورت علمار حق کی بے داری اور ادائے فرض کی ضرورت ہے تمام ائمہ مساجد ہند کے حالات کی تفتیش و تحقیق کے لیے ایک باقاعدہ صیغہ کی، ضرورت ہے ایک مدرسہ کی اور ایک خاص نصاب تعلیم کی جس میں سے مساجد کے پیش امام و خطبار طیار ہو کر نکلیں، لیکن:-

تن ہمہ داغدار شد، پنبہ کجا کجا نہی؟

لوگ مسجد کانپور کے جمع شدہ روپیہ کے مصارف ڈھونڈھتے ہیں، مجھے ایک مرتبہ خیال ہوا کہ اعانت ورثار شہدار و ایتام کے بعد اس سے کانپور میں ایک مدرسہ کیوں نہ طیار کیا جائے؟ جس میں مساجد کے پیش امام اور خطبار کو تعلیم دی جائے؟ روپیہ مسجد کے لیے تھا اور مساجد کے احیار ہی میں اسے صرف بھی کرنا چاہیے۔

جس رسالہ کا عنوان میں ذکر کیا ہے، اصلاح خطبات کے سلسلے میں قابل ذکر ہے۔ مولوی صاحب نے اس میں جمعہ کے چند خطبات اردو میں لکھ کر جمع کیے ہیں۔ اور دیباچہ میں علمار و ارباب فکر سے خواہش کی ہے کہ وہ اس بارے میں انھیں مشورہ دیں،

تاکہ دیگر حصص بھی شایع ہوں۔

میں اس نیک و مفید خیال پر انھیں مبارک باد دیتا ہوں۔ اس قسم کے حقیقی کاموں کو آج کون سوچتا اور کون کرتا ہے۔ البتہ جو طریق تحریر و عبارت انھوں نے اختیار کیا ہے وہ قابل اصلاح ہے۔ لکھنے پڑھنے میں قدیم طرز کی پابندی سے کیا حاصل؟ خطبہ کی عبارت نہایت موثر ہونی چاہیے تاکہ دلوں کو کھینچ لے اور سامع کو اس کا ذوق دوسری طرف متوجہ نہ ہونے دے۔ مطالب بھی جو خطبات میں بیان کیے گئے ہیں، وہی ہیں جو عموماً پرانے خطبوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ طریق اصلاح نہیں۔ اور نہ اس سے کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اصل شے تو مطالب ہی ہے۔ اس میں مسلمانوں کے تمام موجودہ امراض ملی و دینی کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور ان چیزوں اور شریعت کے ان حکموں پر زور دینا چاہیے، جن کے ترک نے مسلمانوں کو فلاح کونین سے آج محروم کر دیا ہے۔

مولوی صاحب اپنے فکر کو وسیع تر کریں۔ میں ان کے حسن ضرورت و اصلاح کا معترف ہوں، مگر مجھے سخت تعجب ہے کہ انھوں نے نفس مطالب میں کیا تبدیلی کی اور کیوں کر ان مضامین پر مطمئن ہو گئے؟

رسالہ غالباً مصنف سے مفت ملے گا۔

(الہلال: ۵ نومبر سنہ ۱۹۱۳ء)

غبطۃ الناظر

"قیمت ۸ - آنہ : سپرنٹنڈنٹ بیکر ہوسٹل - دھرم تلہ - کلکتہ"

عرصہ ہوا، ڈاکٹر اڈورڈ ڈینسن راس سابق پرنسپل مدرسہ کالج کلکتہ نے اسے بعد تہذیب (ایڈٹ) شایع کیا تھا۔ ایک روپیہ قیمت تھی۔ اب نصف کر دی۔

یہ عربی میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کی ایک مختصر سوانح عمری ہے، جس کا قلمی نسخہ بانکی پور کے کتب خانہ سے ہاتھ آیا۔ ڈاکٹر راس دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"یہ ایک نادر کتاب ہے۔ اصل نسخہ میں مصنف کا نام نہ تھا۔ لیکن پہلے صفحہ پر "تالیف المرحوم قاضی القضاۃ الشافعی شیخ الاسلام ابن حجر" کاتب کے ہاتھ سے مسطور ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ ابن حجر عسقلانی کی تصنیف ہے لیکن ابن حجر کی تصنیفات میں اس کا ذکر نہیں۔ تاہم چوں کہ کتاب نادر ہے۔ اور میرے اکثر مسلمان احباب حنفی و قادری ہیں، میں نے چاہا کہ اسے شائع کر دوں۔"

جس زمانے میں یہ رسالہ چھپ رہا تھا، اسی زمانے میں میں نے کہہ دیا تھا کہ اس کی اشاعت مفید نہیں اور نہ اس میں کوئی خاص بات ہے۔ شیخ کے حالات میں مبسوط کتابیں مثل (بہجت الاسرار) وغیرہ کے موجود ہیں اور جابجا انھیں کے حوالے سے اس میں بھی مطالب نقل کیے گئے ہیں۔ پھر طرز جمع و تحریر نہایت عامیانہ اور معمولی ہے۔ حافظ عسقلانی کی تو قطعی نہیں ہو سکتی۔ ابن حجر مکی کی ہو گی کہ ان کی تمام زندگی ایسی ہی تصنیفات میں بسر ہوئی ہے!

افسوس کہ ناواقفیت کی وجہ سے ڈاکٹر موصوف نے لاحاصل وقت اور روپیہ ضایع کیا۔

(الہلال: ۵ نومبر ۱۹۱۳ء)

حدائق البیان فی معارف القرآن

۴۔ روپیہ۔ دفتر اخبار مشرق۔ گورکھپور
۴۴۳۔ صفحہ کی ضخیم کتاب ہے۔ مصنفہ مولانا محمد عبدالغفور صاحب فاروقی ریٹائرڈ سب جج محمد آباد اعظم گڑھ۔

حافظ سیوطی کی ایک نہایت مفید کتاب (اتقان) ہے جس میں قرآن کریم کے جمع و ترتیب، قرأت و رسم الخط، علوم متعلق تفسیر، اور طبقات علوم القرآن وغیرہ کے متعلق مصنفات قدما کا عمدہ انتخاب کیا ہے۔ اس سے قرآن کریم کے متعلق متعدد مباحث و مطالب میں نہایت قیمتی مدد ملتی ہے۔ غالباً اردو کی یہ جدید کتاب اسی سے ماخوذ ہے۔ اور نام میں "معارف" کا جو لفظ ہے، تو اس سے مقصود قرآن کریم کے متعلق مفید معلومات کا التقاط و انتخاب ہوگا، نہ کہ معارف و اسرار و علوم قرآنیہ۔

فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ ضمنی مطالب بھی بہت سے درج کر دیے ہیں۔ مثلاً بحث جہر تسمیہ و قرأت فاتحہ خلف الامام و مناقب امام ابوحنیفہ و رد مخالفین احناف وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کی کیا ضرورت تھی؟

کتاب اس قدر عمدہ چھپی ہے کہ لیتھو کی چھپائی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایسی عمدہ طباعت پر ہم مشرق پریس گورکھپور کو مبارک باد دیتے ہیں۔ کتاب کے کاغذ اور چھپائی کے مقابلے میں قیمت کچھ بھی گراں نہیں۔

(الہلال: ۵ نومبر ۱۹۱۳ء)

ریاض القرا

ناصر الدین محمد مدرس مدرسۂ محمدی۔ رالی پیٹھیہ۔ مدراس

مولانا حاجی محمود صاحب نے یہ اردو رسالہ فن قرات میں مرتب کیا ہے۔ مسلمانوں نے اپنی الہامی کتاب کی جس قدر خدمت کی ہے، دنیا کی کسی قوم نے نہیں کی، لیکن افسوس کہ آج ان کی غفلت بھی اور قوموں سے زیادہ ہے!

ازآں جملہ فن قرأت کی تدوین ہے۔ اسلام جب عجمی اقوام میں پھیلا جو قدرتی طور پر عربی زبان کے مخارج و تلفظ سے ناواقف اور غیر مستعد تھے، تو ضرور ہوا کہ ان کی تعلیم کے لیے کوئی فن ایسا وضع کیا جائے، جس کے ذریعہ وہ حروف عربیہ کا صحیح مخرج ادا کر سکیں۔ پھر طریق قرأت و مباحث وقف وغیرہ بھی اس میں داخل ہو گئے۔ اگرچہ (بقول حضرت شاہ ولی اللہ) اس طرح کے فنون میں انہماک کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معانی کلام اللہ پر تدبر کرنے کی جگہ حرفوں کے مخارج پر تمام قوت تلاوت صرف ہونے لگتی ہے، اور آج کل کے زمانے میں اصلی ضرورت فہم قرآن کی ہے نہ کہ رعایت قرأت کی، تاہم ہر شے کا صحت سے پڑھنا ایک ضروری چیز ہے اور علی الخصوص حفاظ کے لیے تو نہایت ضروری۔

اردو میں پیشتر سے بھی متعدد رسائل موجود ہیں مگر اس رسالے میں یہ بات مزید ہے کہ اصول قرأت کے بعد قرا کے حالات بھی درج کیے ہیں۔

(الہلال: ۵ نومبر ۱۹۱۳ء)

حقیقت اسلام

۶۔آنہ : منشی نور الحسن. کوٹھی مشرف منزل. علی گڈھ

جناب حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی نے اپنے وہ مضامین اس میں جمع کیے ہیں جو انھوں نے "عقائد و احکام اسلامیہ کے عقلی فوائد و مصالح پر مختلف اخبارات میں لکھے تھے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو مذہبی پابندی کی دعوت دی جائے۔"

مذہب کی ضرورت، توحید و رسالت، احکام خمسۂ اسلامیہ، عام اوامر و نواہی، اور اسی طرح کے اکثر ضروری عنوانات پر مضامین ہیں۔ اس قسم کے رسائل کی آج کل جس قدر اشاعت ہو، انفع ہے۔ اسلامی احکام کو غیروں کے سامنے پیش کرنے کی آج اس قدر ضرورت نہیں ہے جس قدر خود مسلمانوں کے آگے۔

(الہلال : ۵ نومبر ۱۹۱۳ء)

مطبوعات جدیدہ :

کرشمۂ قدرت

۱۲۔آنہ۔مولوی نور محمد۔بیر کوہاٹ۔جھنگ

مختلف امراض کے لیے مختلف نسخوں کا ایک مجموعہ ہے، جس میں سب سے پہلے ایک نسخہ تریاق الامراض نامی درج کیا ہے اور اس کے متعلق دعوا کیا ہے کہ تمام بیماریوں یکساں کے لیے مفید ہے! پھر بعض دیگر امراض کے لیے نسخے ہیں۔ آخر میں عرق خضاب وغیرہ کی ترکیبیں۔

(الہلال: ۵ نومبر ۱۹۱۳ء)

مطبوعات جدیدہ :

معلم البنات

(اُردو ریڈر نمبر ۱)

خواجہ فیاض حسن۔مدرسۂ شاہی۔آگرہ

لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم کے ایک سلسلے کا پہلا نمبر ہے، جس میں مفرد حروف سے مرکبات بنائے ہیں۔ ارقام واعداد کے نقشے ہیں۔ نصیحت کے جملے اور چھوٹے چھوٹے خط عزیزوں کے نام دیے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے لیے یقیناً مفید ہوگی۔

(الہلال: ۵ نومبر ۱۹۱۳ء)

انتقاد:

زہرہ

سکریٹری ریاست بھوپال ۲۔ روپیہ

اردو کی یہ ایک نئی حسین وجمیل کتاب ہے، جو مفید عام پریس آگرہ میں چھپ کر ریاست بھوپال سے شایع ہوئی ہے۔

"زہرہ" غالباً حیدرآباد کی کسی خاتون اہل قلم کا تصنیف کردہ ناول تھا، جو انگریزی میں اس خیال سے لکھا گیا تھا کہ مذہب اسلام کی تعلیمات صحیحہ ضمناً ظاہر کی جائیں اور ہندوستانی رسم و رواج کے حسن وقبح نمایاں ہوں۔ مصنفہ نے اپنا نام پوشیدہ رکھا ہے اور صرف "تاج" کے لقب سے کتاب شایع کی ہے۔

اسی ناول کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ مترجم نے بھی مصنفہ کی تقلید میں اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔

ہر کہ خواہد میل دیدن، در سخن بیند مرا

ایک دو صفحے ابتدا کے اور ایک دو صفحے درمیان و اخیر سے میں نے دیکھے۔ ترجمہ بہت صاف، سلیس، بامحاورہ ہے اور غالباً بالقصد انگریزی طرز تحریر کی خصوصیات کو نمایاں ہونے نہیں دیا ہے تاکہ ترجمہ کی جگہ عبارت میں مصنفانہ شگفتگی پیدا ہو جائے۔ گو میں اس طریق کو پسند نہیں کرتا اور ان تمام کتابوں کے لیے جو انگریزی سے ترجمہ کی جائیں، اولین شرط یہ سمجھتا ہوں کہ انگریزی انشا پردازی و بلاغت کو اردو میں گوارا کر کے باصرار وسعی قائم رکھا جائے، تاہم چوں کہ یہ ناول، ناول نہیں ہے بلکہ محض ایک سرگذشت اور چند اشخاص کا مکالمہ، نیز مقصود زیادہ تر تعلیم یافتہ مسلمان خواتین کا مطالعہ ہے، اس لیے عبارت میں اردو سلاست و روانی جس قدر بھی پیدا کی گئی مستحق تعریف ہے کہ نہ مورد تنقیص۔

پلاٹ بالکل سادہ ہے۔ ایک صحیح المذاق، حق پسند، اور مشرق دوست انگریز ایک مقدس مسلمان بزرگ سے ملتا ہے اور اسلام کی تعلیمات اور احکام کی نسبت گفتگو ہوتی ہے۔ مقدس

معلم اسلام کے دین الفطرت ہونے، اس کی بے تعصبی و مساحت، اس کی علم پروری اور انسانیت خواہی، اسلامی قانون ازدواج و طلاق وغیرہ پر مختلف صحبتوں میں لیکچر دیتا ہے اور حق پسند انگریز ہر موقعہ پر اعتراف کرتا ہے۔

اس ضمن میں داستان کی روح رواں "زہرہ" بھی پرورش پا رہی ہے۔ یہ ایک غیر معمولی جذبات و افکار کی ہندوستانی لڑکی ہے، جس کو وہ مقدس معلم اپنی تعلیم و تربیت سے آراستہ کر رہا ہے۔ وہ بڑی ہوتی ہے اور مقدس معلم کے انتقال کے بعد ایک انگریزی اسکول میں داخل ہوتی ہے۔ وہاں کی تعلیم اس کی قدیمی تعلیم سے مل کر اسے ایک حیات تازہ بخشتی ہے۔

نواب نوبت علی خاں، ان کی شادی اور ایک طوائف سے دلبستگی کی چند فصلیں درمیان میں شروع ہو کر پھر زہرہ کے افسانے سے ملادی گئی ہیں۔

جس طرح زہرہ کی سرگذشت کو اسلامی تعلیم کے درس و بیاں کا ذریعہ بنایا تھا، اسی طرح نواب کے خاندان و واقعات کو ہندوستانی رسم و رواج، غیر تعلیم یافتہ ازواج کی نادانیوں اور ہندوستانی طوائف کے جذبات و تعلقات کے بیان کا پیرایہ قرار دیا ہے۔ آخر میں نوبت علی خاں زہرہ سے عقد کرنا چاہتے ہیں مگر وہ اپنے افکار عالیہ میں ایک معصوم انہاک کے ساتھ انسانی زندگی کے علائق سے ملوث ہوئے بغیر، عالم جاودانی کی طرف کوچ کر دیتی ہے۔

افسوس کہ میں ان کتابوں کے بالاستیعاب دیکھنے کی مہلت نہیں رکھتا۔ ایک خاص اصرار کی بنا پر اس کے چند صفحات دیکھے ہیں مترجم کو اس دلچسپ کتاب کی ترتیب پر مبارکباد دیتا ہوں لیکن متمنی ہوں کہ دوسرے ایڈیشن میں نظر ثانی کرتے ہوئے چند امور کا خیال ضرور رکھیں۔

عبارت میں یکسانی اور مواقع و مناظر کا اقتضا ملحوظ رکھنا ہمیشہ ضروری ہے اور افسانہ و قصص میں تو لازم و الزم، لیکن زہرہ میں جابجا نشیب و فراز و شتر گربہ پایا جاتا ہے۔ نیز اشخاص افسانہ کے حالات سے موزوں بھی نہیں۔ عام محاورات اور عامیانہ الفاظ ایک مقام پر بھی ہوں تو پوری کتاب کی وقعت ادبی پر اثر ڈالتے ہیں۔ اگر مقصود تعلیم یافتہ خواتین

کا مطالعہ ہے، تو شادی جان طوائف سے ناظرین کی تقریب کراتے ہوئے یہ بھولنا نہ تھا کہ اس صحبت میں خواتین بھی موجود ہیں۔ کھانے کی میز پر ایک لیڈی بھی موجود ہو تو پوری صحبت اور گفتگو کا پیرایہ بدل جاتا ہے، پھر ایک کتاب کو تو اپنے مخاطبات و ناظرات کا لحاظ رکھنا نہایت ہی ضروری ہے۔

شادی جان کی زبانی عشق و محبت کے جو بے پردہ خیالات ظاہر کیے ہیں، شاید ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ مسلمان لڑکیوں کو سنائے جائیں۔

ابو طالب شاہ کی بیوی کا تذکرہ بہت ہی سخیف الفاظ میں ہے اور مذاق سلیم پر شاق گذرتا ہے۔ شاہ صاحب کو اگر افیون کی عادت تھی تو ضرور نہ تھا کہ اس کی تاریخ بد، ونشو، ان لفظوں میں بیان کی جاتی کہ:۔

"بدقسمتی سے انھیں شکایات دیرینہ تھیں، لہذا بیوی صاحبہ نے خیال کیا کہ ان کے لیے بہترین دوا افیون ہے۔"

ایک خاتون مطالعہ کنندہ کو "شکایات دیرینہ"، کی تحقیق کی زحمت دینا اور اس اخلاق سوز کاوش میں ڈالنا کسی طرح مناسب نہیں۔

پھر شادی جان طوائف کی طرف سے جس استقامت عشق، وثباتِ عہد، و وفائے دل کو ظاہر کیا گیا ہے، وہ بھی ان فتنہ پروران حسن سے بہت بعید ہے۔ چنانکہ افتد و دانی۔ اگر خال خال اس کی مثالیں پائی بھی جائیں تو بھی اس کتاب کو کہ مقصود محاسن اخلاق و معاشرت ہیں، شادی جان سے اس قدر ہمدردی رکھنے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں بھی اس کا عکس نمایاں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

کتاب کی اصل تصنیف ریاست حیدرآباد دکن میں ہوئی ہے، اس لیے ریاست کی تعریف و توصیف کو ایک دو فصلوں میں اس کثرت و غلو سے جگہ دی ہے کہ پڑھنے والا جو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا، بے اختیار گھبرا اٹھتا ہے۔ مترجم کو چاہیے تھا کہ اس حصے کو نکال دیتے یا کم از کم مختصر و گوارا کر دیتے۔

کتاب میں شادی بیاہ کے رسوم اور جاہل عورتوں کے اوہام و خرافات و اعمال

سحریہ و باطلہ نہایت توضیح سے دکھلائے ہیں۔ ضرور تھا کہ اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا جاتا کہ اسلام ان تمام خرافات کا اعدء عدو و دشمن اور ان کو کسی حالت میں جائز نہیں رکھتا بلکہ ان چیزوں سے عقول و اذہان کو نجات دینے کے لیے آیا ہے تاکہ پڑھنے والے پر مسلمانوں کے حالات سے اسلام کی تعلیم مشتبہ نہ ہو جاتی جیسا کہ صدیوں سے ہو رہا ہے۔

مصنفہ نے یہ کتاب انگریزی میں لکھی تھی جس سے مقصود یہی ہو گا کہ انگلستان ہماری حالت کو زیادہ صحت سے سمجھیں۔ پھر کیا وہ انھیں ایک طرف اسلام کی خوبیوں پر حیدرشاہ کا لکچر سنانا چاہتی ہیں، اور دوسری طرف سانچق اور چوتھی کی مشرکانہ و حیا سوز رسمیں اور شادی جان کا عملِ حُب؛

بہر حال بہ حیثیت مجموعی کتاب کی دلچسپی اور اس کے نفع و فوائد میں کلام نہیں۔ انگریزی ناولوں کی طرح درمیان میں دو چار عمدہ چھپی ہوئی ہاف ٹون تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ کتاب مجلد ہے اور سنہری حرفوں میں نام منقش۔ خدا کرے کہ اردو کتابیں اسی طرح فروخت کی جانے لگیں۔

مترجم اعلان کرتے ہیں کہ اس کتاب کی تمام آمدنی اعانت مہاجرین عثمانیہ میں دیدی جائے گی۔ جزاہم اللہ تعالیٰ۔ میں بزور سفارش کروں گا کہ ہر شخص ایک ایک نسخہ اس کا ضرور خریدے کہ موجب ازدیاد معلومات و ذریعۂ سعادت و داخل اعانت خلافت اسلامیہ و مہاجرین مسلمین ہے۔

(الہلال: ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء)

انتقاد :

کوکبہ مملوکی و ملوکی

سید معین الامام صاحب۔ ڈاک خانہ مراد پور۔ بانکی پور۔ ۱۔ روپیہ

مرتبہ مولوی سید ضمیر الدین احمد صاحب رئیس پٹنہ۔

ہندوستان کے عہد اسلامی کا عہد خلجی کئی حیثیتوں سے ایک عظیم الشان اور دلچسپ عہد فرمانروائی رہا ہے۔

یہ شمالی فاتحین کے ترکتاز اور اسلامی فتوحات ہند کے ابتدائی اوراق تھے۔ دجلہ و فرات کا تمدن، جیحوں و ہلمند سے ہو کر نیا فیا گنگا اور جمنا کے کنارے پہنچا تھا مسلمانوں کے روز اقبال کی جو روشنی آریا ورت میں پھیلنے والی تھی، اس کی ابھی صبح ختم نہ ہوئی تھی۔

غور اور غزنی کے نبرد آزما ہندوستان میں بس گئے تھے لیکن ابھی ہندوستان کی سحر کارانہ کشش سے مسحور نہیں ہوئے تھے، جس نے آگے چل کر اخلاق عرب و فارس کو رسم و رواج ہند کی آمیزش سے بالکل متغیر کر دیا۔

اس دور کا آغاز سلطان محمود بن سبکتگین کے حملوں سے شروع ہوتا ہے اور پھر عہد مملوکی و خلجی کے اواخر تک قائم رہتا ہے۔ یہ کتاب اسی عہد کی ایک تاریخی داستان ہے اور قطب الدین خلجی تک کے حالات نہایت سلیس اور شگفتہ عبارت میں ترتیب دیئے ہیں۔

اسلام نے حقیقی مساوات نوع بشر میں قائم کی۔ اگر دنیا کو رسم غلامی کی شکایت ہے کہ شریعت موسوی کی قائم کردہ بنیاد، تمدن یونان و روم کی پرورش کردہ رسم، اور (مسیح) کے پسند کردہ انسانی استرقاق کو مسلمانوں نے بالکل نیست و نابود نہیں کر دیا، تو اس میں شک نہیں کہ ہمارا عمل ایسا ہی رہا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ہماری تاریخ کا ایک اخلاقی معجزہ وحید بھی دنیا کبھی نہ بھلا سکے گی۔ اگر ہم نے خاص خاص شرطوں کے ساتھ اسیران جنگ کو غلام بنایا بھی

تو اس طرح بنایا، کہ ان کو تخت حکومت پر چتر شاہی کے نیچے جگہ دی، اور خود ان کے آگے دست بستہ کھڑے رہے۔

تاریخ اسلام کے مختلف حصوں میں غلام و مملوک تخت حکومت پر فرماں روا نظر آئیں گے۔ ایک دو غلام تو اکثر حکومتوں میں فرماں روائی تک پہنچے۔ (متنبی) کے بد قسمت ممدوح (کافور) کو کون نہیں جانتا؟ مصر میں فاطمی خلافت دراصل چرکس غلاموں ہی کے ہاتھ میں تھی جو ممالیک کے نام سے حکمرانی کرتے رہے، تاآنکہ سلطان سلیم عثمانی نے مصر فتح کیا۔

اصل یہ ہے کہ اسلام نے جو روح حریت اپنے پیروؤں میں پھونک دی تھی، وہ صرف انسانیت اور اس کے خصائل کو ڈھونڈتی تھی۔ لوگ غلاموں کو رکھتے تھے مگر انھیں غلام نہیں سمجھتے تھے۔ بادشاہوں نے اپنے ولی عہدوں کی طرح ان کو پرورش کیا اور جب کبھی کسی نے اپنے خصائل و فضائل کا ثبوت دیا تو اس پر ایک کامل حر کی طرح ترقی کی وہ تمام راہیں کشادہ ہوگئیں جو شہزادوں اور ارکان سلطنت کے لیے ہو سکتی تھیں۔

یہ تو تاریخ کا عالم ہے۔ حسن و عشق کی دنیا میں آیئے تو ایک دلچسپ تذکرہ چھیڑ دوں۔ غلاموں میں ہی وہ ایاز بھی تھا کہ بندگی و مملوکی سے گذر کر آقائی و بندہ پروری تک پہنچ گیا تھا۔ اور دل کی غلامی کے آگے سلطنتوں کی غلامی ہیچ ہے۔

دست مجنوں و دامن لیلیٰ — روئے محمود و خاک پائے ایاز

ہندوستان میں بھی ایک شاندار عہد حکومت غلاموں کا گذر چکا ہے۔ یہ کتاب اسی کی تاریخ ہے۔

کتاب کی عبارت شگفتہ و رواں ہے۔ دربار اکبری کے طرز تحریر کی تقلید کی جابجا کوشش کی ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تمام کتاب کو محض ایک مسلسل سرگذشت کی صورت میں کیوں لکھا گیا؟ پوری کتاب میں ابواب و فصول یا عہد و سنین کی کوئی تقسیم نہیں۔ علاوہ اس کے کہ تاریخی تصنیفات کے لیے یہ طریق موزوں نہیں، پڑھنے والے کو بھی اس سے الجھن ہوتی ہے اور وہ ایک ایسی سڑک میں گھر جاتا ہے جو بغیر کسی موڑ کے میلوں چلی گئی ہو۔ (الہلال: ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء)

مطبوعات جدیدہ :

بزم فرید

ایڈیٹر نظام المشائخ دہلی۔ ۱۰۔ آنہ

حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر کی ملفوظات حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی نے فارسی میں جمع کی تھی جس کا نام "راحت القلوب" ہے۔ یہ اسی کا اردو ترجمہ ہے۔ مرتبۂ مولوی محمد واحدی ایڈیٹر نظام المشائخ۔ ترجمہ بہت صاف اور سلیس ہے۔ لکھائی چھپائی بھی بہت اچھی ہے۔

(الہلال: ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء)

مطبوعات جدیدہ :

عقائد عثمانی

۲۔ آنہ: مہتمم کتب خانہ نعمانیہ حیدر آباد۔ دکن

ابتدائی تعلیم کا ایک مفید رسالہ ہے۔ اسلامی عقائد ضروریہ اور اوامر و نواہی کو صاف اور سلیس عبارت میں درج کیا ہے۔ خوش خط اور جلی قلم۔

(الہلال: ۵ نومبر ۱۹۱۳ء)

تذکرہ بہادرانِ اسلام

مولوی عبدالرحیم تاجر کتب مسجد چیاں۔ لاہور ۲۔ روپیہ ۸۔ آنہ

صوفی کرم الٰہی صاحب ڈنگوی نے یہ کتاب دو حصوں میں لکھی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ تاریخ اسلام کے مشہور فاتحین و ملوک اور ابطال و امجاد کے حالات اردو میں یکجا جمع کیے جائیں۔

یہ پہلا حصہ ہے۔ ضخامت ۵۲۰ صفحہ کی ہے۔ فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام کے آغاز سے دولت عثمانیہ کے موجودہ عہد تک کے نامورانِ جنگ کو منتخب کیا ہے اور الگ الگ عنوان سے ان کے حالات لکھے ہیں۔ وہ تمام عنوانات جو فہرست میں ہیں اگر شمار کیے جائیں تو دو تین سو سے کم نہ ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً تمام اسلامی حکومتوں کی فتوحات کے حالات لیے ہیں اور ہر عہد فرماں روائی کے نامورانِ جنگ کو چنا ہے۔

ہر زبان میں تصنیفات کے مختلف مراتب ہوتے ہیں اور اردو میں بھی ہونے چاہئیں ایک ذخیرہ محققانہ مصنفات کا ہوتا ہے جن کا لفظ لفظ نقد و نظر کی دعوت دیتا ہے۔ دوسرا درجہ عام تصنیفات کا ہوتا ہے جس سے صرف مفید اور ضروری معلومات کی فراہمی مقصود ہوتی ہے اور بس۔ عام مطالعہ کے لیے لائٹ لٹریچر میں بھی تاریخ و علوم کو لینا چاہیے۔

یہ کتاب اسی قسم کی ہے۔ تاریخی تحقیقات کے لحاظ سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اس سے کہ محض تفریحِ طبع کے لیے قصص و خرافات کا مطالعہ کیا جاتا ہے، اس کی جگہ اپنی تاریخ ہی کی ایک مفید و دلچسپ داستاں کیوں نہ پڑھی جائے؟ البتہ افسوس ہے کہ کتاب کی عبارت شگفتہ نہیں اور یہ اس لیے ضروری تھا کہ کتاب کی اصلی حیثیت عام مطالعہ کی ہے، نہ کہ تاریخی تحقیقات و ترتیبات کی۔ پھر اگر عبارت بھی شگفتہ نہ ہو تو اس سے کیا حاصل؟

(الہلال: ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء)

جہنم سے دوسرا خط

مولوی شرف الدین احمد خاں صاحب رامپور ۲۔آنہ

خان بہادر سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی نے یہ ریویو اشاعت کے لیے بھیجا ہے :

یورپ اور جہنم

ایک علم دوست اور شائق تحقیق یوربین صاحب عالم خیال میں بہ حالت مرض یا تندرستی جہنم میں پہنچے اور وہاں بہت کچھ دیکھا اور اپنے اعمال کی سزا کو پہنچے۔ انھوں نے چند خطوط میں تمام حالات لکھے ہیں۔ بہت سی روایات مذہبی کی تصدیق کرتے ہیں۔ نہ صرف ان کے ملک والوں نے بلکہ انگلستان اور دوسرے یوروپین ملکوں نے بھی اس کتاب کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا ہے ہمارے لائق دوست منشی شرف الدین احمد صاحب ملازم سررشتۂ تعلیم ریاست رامپور نے بھی تین خطوں کا ترجمہ بہت خوبی اور صفائی سے کیا ہے۔ ایسی حالت میں کہ مذہبی تعلیم کم ہو گئی ہے، کون ایسا ہے کہ ان خطوں کو دلچسپ یا مفید نہ پائے۔ شاید چار آنوں سے زیادہ قیمت نہیں ہے۔

(الہلال : ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء)

رسالۂ ذیابطیس

حکیم غلام نبی صاحب زبدۃ الحکما لاہور: ۱۔ روپیہ

مرض ذیابطیس کی تحقیقات وتشخیص وعلاج میں یہ اردو رسالہ حکیم صاحب نے مرتب کیا ہے۔ دیباچہ میں طب و ڈاکٹری کی ۲۲۔ کتابوں کی فہرست دی ہے، جن سے اس کی ترتیب میں مدد لی گئی ہے۔ ایک دو نام سنسکرت کتابوں کے بھی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب مستند مواد سے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ مرض مہلک وجانستاں اکثر ایسی حالتوں میں ہوتا ہے کہ عرصے تک مریض کو اس کی طرف چنداں توجہ نہیں ہوتی۔ اور بالآخر لاعلاج صورت اختیار کرلیتا ہے۔ ہمارے ملک میں صحیح معلومات کی طبی کتب کم پڑھی جاتی ہیں اور اردو میں لکھی بھی نہیں گئی ہیں۔ حالانکہ (بقول اسپنسر) ان علوم وفنون کے مطالعہ وانہماک سے، جو زندگی اور صحت میں کام آتے ہیں، زیادہ مقدم وہ علوم ہیں، جن سے زندگی اور صحت حاصل ہوتی ہے۔

(الہلال: ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء)

تعلیم التسوید

مرتبہ مولوی مسلم صاحب عظیم آبادی، ۱۰ آنہ

تحریر و انشا کی ایسی کتابیں جو صحت مذاق کے ساتھ لکھی گئی ہوں، اردو میں بالکل نہیں ہیں یا شاید ایک دو ہیں مگر النادر کالمعدوم۔

یہ چھوٹا سا نیا رسالہ اس بارے میں کئی لحاظ سے غنیمت ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ طلبا کو ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو مضمون نگاری و عام تحریر و تسوید کی تعلیم میں مدد دے۔ سب سے پہلے آداب تحریر کی سرخی سے لکھا ہے کہ کاغذ عمدہ ہو، سیاہی روشن، حاشیہ بکثرت چھوڑ دیا جائے، بین السطور ایک سطر کی جگہ خالی رہے، علامت وقف (پنکچویشن) کا خیال رکھو۔ ہائے مخلوط و غیر مخلوط اور یائے معروف و مجہول کے امتیاز کو نہ بھولو۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں یہ پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ کتاب کا باقی حصہ تو طلبا کے لیے چھوڑ دیا جائے مگر اتنا حصہ کم از کم وہ حضرات اہل قلم ضرور ملاحظہ فرمالیں جو آج کل اخبارات و رسائل میں مضامین لکھ کر بھیجتے ہیں یا طول طویل خط و کتابت کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ اس تعلیم کا حق تخاطب انھیں بزرگوں کو حاصل ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ کاغذ و سیاہی، اور فکر و توجہ کا تھوڑا سا بھی بخل ان غریبوں کے لیے کیسی اشد شدید مصیبت ہوتا ہے، جن سے خط کے مفصل جواب مانگے یا مضامین کی فوری اشاعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

کتاب کا طرز تعلیم بہت اچھا ہے اور عبارت آج کل کے مذاق کے مطابق۔ البتہ زبان کی غلطیاں تھوڑی بہت ہیں جو اہم نہیں۔ ہر درجہ کے لوگوں کے خطوط اور مختلف طرح کے مضامین کے ابتدائی نمونے بھی دیے ہیں۔

(الہلال: ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء)

ظل السلطان

مولوی محمد امین صاحب زبیری۔ سالانہ مع محصول ۲۔ روپیہ

اُردو کا ایک حدیث الاشاعت ماہوار رسالہ ہے جس کے اب تک شاید پانچ چھ نمبر نکل چکے ہوں گے۔

پہلے نمبر میں ظاہر کیا گیا ہے کہ سرکار عالیہ بھوپال اور بعض ارکان خاندان شاہی نے اسکی سرپرستی منظور فرمائی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسالے کی بنیاد محکم اور امید افزا ہے۔

رسالہ کا مقصد "ہندوستانی خواتین میں اشاعت تعلیم، اور ان کے لیے مفید معلومات بہم پہنچانا" ہے۔ میں نے ایک دو نمبر دیکھے اور رسالہ کے مقصد اور مخاطبات کی حالت کے لحاظ سے ان کو بہتر پایا۔ اکثر مضامین خواتین بھوپال اور مدارس نسوانیہ ریاست کی معلمات وغیرہ کے قلم سے نکلتے ہیں اور ایک ایسے پرچے کے لیے یہ ضرور موزوں ہے کہ اس کا زیادہ تر مواد خود خواتین کا مہیا کردہ ہے۔

لیکن تاہم کام بلند سے بلند تر ہونا چاہیے۔ صرف چند مضامین کا اکٹھا کر دینا ایسی بات نہیں کہ کسی رسالے کے لیے خصوصیت ہو۔ یہ بات پیشتر سے اور رسالوں میں موجود ہے۔ ایک رسالہ جو ایک خاتون فرماں روا کے دارالحکومت سے نکلتا ہے، ضرور ہے کہ کوئی امتیاز بھی رکھے۔ ایڈیٹر صاحب کو چاہیے کہ انگریزی رسائل پر نظر ڈالیں۔ تعلیم و تربیت نسواں کے صیغہ میں اب تک ہم نے کچھ بھی نہیں کیا اور لٹریچر کی یہ شاخ بالکل خالی ہے۔ نہایت آسانی کے ساتھ ہر ماہ ایسا مواد بہم پہنچایا جا سکتا ہے جو خاص طور پر تعلیم یافتہ عورتوں کے مذاق و اخلاق کی اصلاح کرے اور ان کے لیے بلند درجہ کی مگر آسان اور سہل زبان میں توسیع معلومات کا ذخیرہ ہو۔

اصلاح رسوم، تعلیم مذہبی، تصحیح اعتقاد، تربیت اخلاق، مبادیات علوم، نتیجہ خیز قصص وحکایت، اور اس طرح کی صدہا چیزیں ہیں جو بغیر کسی کاوش وجہد تصنیفی کے لکھی جاسکتی ہیں۔ بڑی ضرورت یہ ہے کہ تعلیم یافتہ عورتوں کی سطح ترقی آہستہ آہستہ بہ نہج صحیح و بہ تحفظ آداب واخلاق، بلند کی جائے۔ محض چند مضامین کی اشاعت اس کے لیے کافی نہیں۔ خود اڈیٹوریل حصے میں رسالے کے نصف سے زیادہ صفحات صرف ہونا چاہئیں۔

(الہلال: ۱۰ دسمبر ۱۹۱۳ء)

مطبوعات جدیدہ :

عقلِ کُل

سید ابوالحسن موجد۔ ہملٹن روڈ۔ دہلی۔ ۱۰/۱ آنہ

سید صاحب نے اس رسالے میں اردو مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ رائٹنگ) کے قواعد مرتب کرکے لکھے ہیں۔

اُردو میں مختصر نویسی کی ایجاد و ترتیب کی اس سے پہلے متعدد اشخاص کوشش کر چکے ہیں لیکن پچھلے دنوں لکھنؤ میں یہ ایجاد نہ صرف تکمیل ہی تک پہنچی، بلکہ گورنمنٹ کی اعانت سے عملی طور پر اس کا درس بھی شروع ہوگیا اور اس وقت متعدد اشخاص سی۔ آئی۔ ڈی میں ملازم ہیں۔ البتہ سخت ضرورت ہے کہ اس کا رواج عام طور ہو۔

معلوم نہیں لکھنؤ میں جو طریقہ مرتب ہوا، وہ اس رسالے سے زیادہ جامع و بہتر ہے یا نہیں؟

اس رسالے میں حروف تہجی کی مفرد علامتیں قرار دے کر پھر ان کی ترکیب کے مختلف اشکال و طرق متعدد اسباق میں لکھے ہیں اور مشق کے لیے جا بجا عبارتیں دی ہیں۔

انگریزی کی علامتیں موجود ہیں اور حروف مشترک، اس لیے اردو مختصر نویسی کی ایجاد و ترتیب سے مقصود صرف یہ ہے کہ خاص عربی و فارسی حروف کی علامتیں اس طرح وضع کردی جائیں کہ مختصر نویسی کے آداب و شروط ہاتھ سے نہ جائیں۔ چنانچہ سید صاحب نے تمام حروف عربیہ و عجمیہ کے لیے نئی علامتیں قرار دی ہیں اور ان کے لیے خاص قواعد وضع کرکے مثالوں سے جا بجا وضع کیا ہے۔

گورنمنٹ صوبجات متحدہ اس ایجاد سے صرف پریس کے صیغے میں مدد لے رہی ہے تاکہ پولٹیکل جلسوں وغیرہ کی تقریریں ضبط ہو سکیں۔ مگر ضرورت ہے عام طور پر اس سے فائدہ اٹھانے کی۔ سید صاحب دہلی میں اگر اپنے ایجاد کردہ قواعد کی تعلیم سے ایک دو شخص طیار کریں تو اشاعت رسائل سے یہ زیادہ بہتر ہو۔

(الہلال: ۱۰ ار دسمبر ۱۹۱۳ء)

مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کی دو نایاب کتابیں

(از مولانا شبلی نعمانی)

مولانا غلام علی آزاد ان وسیع النظر محققین میں سے ہیں کہ ان کے ہات کی دو سطریں ہات آجاتی ہیں تو اہل نظر آنکھوں سے لگاتے ہیں کہ ذخیرۂ معلومات میں قابل قدر اضافہ ہو گیا۔ اہل ملک کی خوش قسمتی ہے کہ مولوی عبداللہ خان صاحب (کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد) کی کوششوں سے ان کی تصنیفات سے دو نہایت اعلیٰ درجہ کی تصنیفیں آج کل شایع ہوئی ہیں۔ سرو آزاد اور ماثر الکرام۔ سرو آزاد خاص شعرائے متاخرین کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ جامعیت حالات کے ساتھ یہ خصوصیت بھی رکھتا ہے کہ اس میں جو انتخابی اشعار ہیں، اعلیٰ درجہ کے ہیں، ورنہ آزاد کے متعلق یہ عام شکایت ہے کہ ان کا مذاق شاعری صحیح نہیں اور خزانہ عامرہ اور ید بیضا میں انھوں نے اساتذہ کا جو کلام انتخاباً نقل کیا ہے، اکثر ادنیٰ درجہ کے اشعار ہیں۔

ماثر الکرام میں ان حضرات صوفیہ کے حالات ہیں جو ابتدائے عہد اسلام سے اخیر زمانہ تک ہندوستان میں پیدا ہوئے۔

دونوں کتابوں میں عام حالات کے ذیل میں ایسے مفید اور نادر معلومات ہیں جو ہزاروں اوراق کے الٹنے سے بھی ہات نہیں آسکتیں۔ میں آزاد کی روح سے شرمندہ ہوں کہ علالت اور ضعف کی وجہ سے ان کی نادر تصانیف کے ریویو کا حق ادا نہ کر سکا اور صرف چند اشتہاری جملوں پر اکتفا کرتا ہوں، لیکن مجھے امید ہے کہ شایقین فن، شوق خریداری کا ثبوت دے کر ان کی روح سے شرمندہ نہ ہوں گے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے: عبداللہ خاں صاحب کتب خانہ آصفیہ۔ حیدر آباد دکن۔

(الہلال: ۱۰ دسمبر ۱۹۱۳ء)

اردو علمِ ادب اور ایک فرماں روا مصنفہ

(علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم)

ذوق علم اور امارت و ریاست، ایک وجود میں بہت کم جمع ہوتے ہیں۔ اگر تمام دنیا کی تاریخ سے امثال علم و کمال یکجا جمع کیے جائیں تو معلوم ہوگا کہ علم کو فقر و افلاس سے ایک خاص مناسبت رہی ہے۔ اس کا جمال مقدس ہمیشہ جسم خاک آلود، بوریائے شکستہ، اور گلیم صد پیوند کے ساتھ جلوہ آرا ہوا ہے اور تخت حکومت اور ایوانِ عیش و راحت کو بہت کم اس کی ہم آغوشی نصیب ہوئی ہے۔

به سوز عشق شاہاں را چہ کار ست
کہ سنگ لعل خالی از شرار ست!

اللهم احيني مسكيناً، وامتني مسكيناً واحشرني في زمرة المساكين.

تاہم مبدءِ فیاض کی بخشش و سخا کی کوئی حد نہیں۔ بعض ایسے شاندار مستثنیات بھی اس کلیہ میں موجود ہیں جن کا وجود دربار شاہی و اجلال اور مجلس علم و کمال، دونوں کے لیے موجب افتخار رہا ہے: وما احسن الدين والدنيا لو اجتمعا۔

خصوصیت کے ساتھ تاریخ اسلام اس امتیاز خاص سے سرفراز رہی ہے۔ اسلام کی علم پروری نے جو روح علمی اپنے پیروؤں میں پیدا کر دی تھی، اس کی کار فرمائیوں کو تخت حکومت کی مشغولیتیں نہ روک سکیں۔ وہ امراء و شاہان اسلام جو صبح کو دربار شاہی میں نظم ممالک اور فتح بلدان کے احکام نافذ کرتے تھے، ایک وقت آتا تھا کہ تخت حکومت کی جگہ فرش مجلس پر، اور نیام شمشیر کی جگہ قلمدان تصنیف و تالیف کے سامنے، اوراق کتب اور

اجزار صحائف کی جمع و تدوین میں مصروف ہو جاتے تھے۔

ابو ہاشم خالد بن یزید بن معاویہ نے فن کیمیا (کیمسٹری) اور طب میں کتابیں تصنیف کیں۔ قاضی ابن خلکان نے اس کا ترجمہ لکھا ہے اور ابن الندیم نے کتاب الحرارت اور کتاب الصحیفہ اس کی تصنیفات میں سے دیکھی تھی۔ خلیفہ المعتز عباسی ایک اول درجہ کا ادیب و مصنف تھا۔ نوح سامانی کی تصنیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ صاحب ابن عباد کی شہرت اس قدر ہے کہ تذکرہ کی ضرورت نہیں۔ ابو الفدار کی تاریخ مشہور ہے۔ جمال الدین قفطی نے تاریخ الحکمأ ایوان عمارت میں لکھی۔ سلطان محمد فاتح عثمانی کی ایک تصنیف قسطنطنیہ میں اب تک موجود ہے۔ بادشاہوں کی خود نوشتہ سوانح عمریاں (آٹو بائیو گرافی) فارسی علم ادب کا ایک امتیاز خاص تسلیم کیا گیا ہے۔ تزک بابری اور جہانگیری ہمارے پاس موجود ہیں۔

تصنیف و تالیف سے قطع نظر کر کے اگر محض علم و فن کے لحاظ سے دیکھا جائے، تو تاریخ اسلام سے صدہا خلفا و امرا کے نام چھانٹے جا سکتے ہیں اور بلا خوف تغلیط دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ علم و امارت کے اجتماع کی مثالیں جس قدر تاریخ اسلام پیش کر سکتی ہے، دنیا کی کوئی متمدن قوم نہیں پیش کر سکتی۔

لیکن انقلاب کا یہ کیسا درد انگیز منظر ہے کہ جس قوم نے تلوار کے سائے اور تخت کی خود فراموشیوں میں بھی حیات علمی بسر کی ہو، آج اس کے مدارس و جوامع کے صحن اور علم و فن کی مجالس ذوق علمی سے خالی ہیں، اور ایوان و دربار سے کیا امید کیجیے کہ خود ہمارے مدرسے اور دار العلوم ہی اب مصنف پیدا کرنے سے عاجز ہو گئے ہیں۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا ہے یہ

(فرماں روائے بھوپال)

الحمدللہ کہ ایک نظیر موجودہ عالم اسلامی میں ایسی موجود ہے، جو ملک اور ریاست بانی کے ساتھ شوق علم اور ذوق تصنیف و تالیف کو بھی جمع کرتی ہے، اور مزید براں یہ کہ وہ صنف رجال میں سے نہیں ہے جس کو اپنے تقدم کا ہمیشہ غرور بے جا رہا ہے، بلکہ اس صنف اناث میں

سے ہے جس کو دماغی و ذہنی اشغال سے ہمیشہ معذور سمجھا گیا ہے، اور فی الحقیقت اگر ایسی ہی چند مثالیں ہر دور میں ملتی رہیں تو بقول متنبی کے:

لفضلت النساء علی الرجال

فی الحقیقت یہ وجود گرامی آج نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلامی کے لیے موجب صد افتخار ہے۔ حضور عالیہ کی ذاتی قابلیت ولیاقت، قوۃ تدبر ونظم ریاست، سیاست دانی وکار فرمائی، جوش ملی واسلام خواہی، علم پروری وجود وسخا، اعمال خیریہ وکار ہائے حسنہ، ایسے اوصاف جلیلہ وعظیمہ ہیں، جن میں سے ہر ایک وصف بجائے خود کسی انسان کے شرف وامتیاز کے لیے بہترین وسیلہ ہو سکتا ہے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ وہ بہ حیثیت ایک مصنفہ واہل قلم کے بھی جلوہ افروز ہیں، اور مسلسل تین مفید ودلچسپ کتابیں ان کی تالیفات میں سے چھپ کر شایع ہو چکی ہیں۔

ہر کام کی قیمت اس کے عوارض واضافی حالات کی نسبت سے قرار دی جاتی ہے اگر ایک فقیر علم، مدرسہ وخانقاہ کے حجرے میں بیٹھ کر، دنیا کے تمام تفکرات وترددات سے قطع تعلق کر کے، تصنیف وتالیف میں مصروف ہے تو اس کے اشغال علمیہ کے نتائج جس قدر بھی اعلیٰ واکمل ہوں، ہونے ہی چاہئیں۔ ولکل فن رجال۔

لیکن ایک فرماں روائے ریاست لاکھوں مخلوقات الٰہی کی نگرانی وخدمت گذاری اور ایک پورے خطۂ ارضی کے نظم وادارہ کے ساتھ اگر ایک صفحہ بھی تالیف کر کے پیش کر دے تو ہزار درجہ اس سے کہیں زیادہ موجب استحسان وشرف واحترام ہے!

میں ریاست بھوپال کی خدمات دینی وقومی کا تذکرہ نہیں کروں گا، کیوں کہ یہ امر اب اس درجہ واضح وآشکارا ہے کہ محتاج تفصیل نہیں۔ ہر شخص جو موجودہ قومی ودینی وعلمی، کاموں کے حالات سنتا رہتا ہے، اس سے بے خبر نہیں ہے کہ اس ایک ہی آفتاب جود وسخا کی روشنی کس کس گوشے کو منور نہیں کر رہی؟

رشک آیدم بہ روشنی دیدہ ہائے خلق

دانستہ ام کہ از اثر گرد راہ کیست؟

حق یہ ہے کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی ایک بہت بڑی بخشش وتوفیق ہے جو فرماں روائے

بھوپال کو مرحمت ہوئی ہے۔ دولت و قوت ایک امانت الٰہی ہے، جو صرف اس لیے ہے تاکہ ایک خادم و امانت دار کی طرح اس کی نگرانی کی جائے، اور اس کو بندگان الٰہی کی خدمت اور مرضات الٰہیہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، اور جس خوش طالع کو امارت و ریاست کے ساتھ استعمال صحیح کی بھی قابلیت عطا ہو، اس سے بڑھ کر اس آسمان کے نیچے کوئی خوش بخت نہیں۔ زاہدان شب زندہ دار جو صائم الدھر اور دائم نوافل گذار ہوں، مجاہدین فی سبیل اللہ جو اپنے نفوس کو حفظ کلمۂ حق و صداقت کی راہ میں قربان کریں، علمائے شریعت اور صوفیائے طریقت، جو اپنی خدمات علم و تفقہ اور ارشاد و ہدایت سے خلق اللہ کو سعادت اندوز فرمائیں، یہ سب کے سب بھی ان مدارج عالیہ اور فضائل الٰہیہ سے محروم ہیں، جو اس خوش نصیب کو حاصل ہوں گے۔

پس اصل یہ ہے کہ اگر حق تعالےٰ نے سرکار عالیہ کو خدمت ملک و ملت کی توفیق مرحمت فرمائی ہے، تو اس کے لیے قوم کو جتنا ان کا شکر گذار ہونا چاہیے، اس سے کہیں زیادہ خود ان کو اللہ کا شکر گذار ہونا چاہیئے، اور انسان کو چاہیئے کہ انسانوں کی مدح کم کرے پر خدائے قدوس کی حمد و ثنا زیادہ بجالائے۔ ولئن شکرتم لازیدنکم، ولئن کفرتم، ان عذابی لشدید۔

تمام ملک ان کی سچی مدح سے گونج رہا ہے، مگر میں مدح مزید کی جگہ یہ عرض کروں گا کہ وہ اور زیادہ شکر نعمت بجالائیں، اور سعی فرمائیں کہ اس سے بھی زیادہ کارہائے خیر ان کی ذات شاہانہ سے تعمیر و رونق پائیں۔ وقت ہے کہ ان کی توجہ عالی کسی عظیم الشان دینی خدمت کی طرف مبذول ہو کہ ملت بیضا اپنی غربت اولیٰ میں مبتلا ہو گئی ہے، اور ایسے افراد عالیہ کی از بس محتاج ہے۔

بہر حال سر دست مقصود حضور عالیہ کی تصنیفات ہیں، جن میں سب سے پہلے ضخیم و مطول خود نوشتہ سوانح عمری یا تزک سلطانی ہے، اور دو تازہ مطبوعات تربیت اطفال اور حفظان صحت کے متعلق ہیں۔

اردو علم ادب اپنے صف مصنفین میں ایک ایسے وجود گرامی کی موجودگی پر جس قدر شادماں و نشاط کار ہو کم ہے، سوانح عمری کے مطالعہ کا اب تک مجھے موقع نہیں ملا۔ سردست

آخری رسائل کے متعلق آیندہ نمبر میں کچھ عرض کروں گا:

ولو کان النساء کمن ذکرنا
لفضلت النساء علی الرجال!

(الہلال: ۷، ۱۴ جنوری ۱۹۱۴ء)

انتقاد:

بڑی جنتری ۱۹۱۴ء

قیمت ایک روپیہ۔ نامی پریس۔ کانپور

جناب منشی رحمت اللہ صاحب رعد کے نامی پریس اور ان کی خوش نما و دلچسپ تقویم نے اپنی صوری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے جو شہرت تمام ملک بلکہ بیرون ہند تک میں حاصل کر لی ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔

ہر سال ملک کو ان کی تقویم کا انتظار ہوتا ہے، انھوں نے سنگی طباعت کے جو نمونے اپنی مطبوعات علی الخصوص سالانہ تقویم کی رنگین تصاویر اور مطلاؔ و مذہب میناکاری میں دکھلائے ہیں، وہ ان کی طبع صنیع اور کمال فن پر گواہی دیتے ہیں۔

نئے سال کی جنتری بھی مرتب ہو کر شایع ہو گئی ہے۔ افسوس ہے کہ باوجود خاموش اور پُرسکون زندگی کے وہ مسجد کانپور کے الم ناک حوادث سے محفوظ نہ رہ سکے، اور اس کی پریشانیوں کی وجہ سے تقویم کی ترتیب و اشاعت میں دیر ہو گئی۔

سال تمام کا سب سے بڑا حادثہ مسجد مچھلی بازار کانپور کا واقعہ تھا اس لیے ابتدا میں اس کی تصویر دی ہے۔ معمولی تقویمی جداول و مطالب کے حسب معمول تاریخی حصہ علاوہ "تاریخ افغانستان کا باتصویر ہے۔ مصوری و نقاشی کے متعلق ایک نہایت دلچسپ مضمون درج کیا ہے اور انگریزی کے باتصویر جغرافی نقشوں کے اصول پر تمام قطعات ارض کے نقشے بھی دیے ہیں، جن میں ان ممالک کی مشہور بحری و ارضی پیداوار، عمارتیں، بحور و انہار، اور خصوصیات ملکی دکھلائے گئے ہیں جو نہایت دلچسپ ہیں۔

(الہلال: ۷، ۱۴ جنوری ۱۹۱۴ء)

تندرستی

گذشتہ اشاعت میں ہم ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال کے سلسلۂ تصنیفات کا ذکر کر چکے ہیں۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلے ان کی مفید ترین تصنیف "تندرستی" پر نظر ڈالتے ہیں۔

کتاب کی لوح پر لکھا ہے کہ "علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال بالقابہا نے متعدد انگریزی کتب حفظانِ صحت وغیرہ سے مطالب اخذ کر کے اور اپنی اعلیٰ معلومات و مفید تجارب شامل کر کے تالیف فرمایا"۔

کتاب عمدہ کاغذ اور عمدہ لکھائی کے ساتھ چھپی ہے۔ ۱۵۲ صفحے اصل کتاب کے ہیں۔ عبارت نہایت صاف و سلیس ہے اور طبی ترتیب مطالب کے مطابق ابواب و فصول میں منقسم۔

کتاب کا موضوع یہ ہے کہ اردو زبان میں علم طب کے اصول پر وہ مطالب جمع کیے جائیں، جن کے مطالعہ سے ہر شخص اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی کے لیے صحت و تندرستی اور قوت و توانائی حاصل کر سکے، اور فی الحقیقت کسی قوم کی حیاتِ دماغی اور ارتقارِ ذہنی کے لیے پہلی چیز صحت اور قوتِ جسمانی ہے۔

مصنفۂ عالیہ دیباچہ میں لکھتی ہیں:

"میں نے یورپ کے سفر میں وہاں کے لوگوں کو خواہ وہ کسی طبقہ کے ہوں اصول و قواعدِ حفظانِ صحت کا پابند پایا، اور بارہا مجھ کو اپنے ہندوستان کی حالت پر افسوس آیا، ہمارے ملک میں عالیشان محلوں میں بھی وہ صفائی نہیں ہوتی، جو وہاں کے ایک غریب مزدور کے چھوٹے سے مکان میں نظر آتی ہے۔

وہاں عورتوں میں جن پر قدرت نے خانہ داری اور اولاد کی تربیت جسمانی و

روحانی کا فرض عاید کیا ہے اس فرض کے ادا کرنے کی قابلیت بھی پیدا کرائی جاتی ہے، اور تمام عورتیں بغیر امتیاز مراتب حفظان صحت، تیمار داری، اور خانہ داری کی تعلیم حاصل کرتی ہیں اور اس کے فوائد سے مستفید ہوتی ہیں۔

وہاں کے مصنف، عالم، ڈاکٹر، ایسی تصنیفات و تالیفات کو اپنا ضروری و قومی فرض تصور کرتے ہیں، اور اپنی قابلیت و محنت سے ملک کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔

ان ہی اغراض کے لیے متعدد رسالے اور اخبارات شایع ہوتے ہیں اور یہ تعلیم یافتہ خواتین ان کو نہایت دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں بالکل برعکس حالت ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ نرسری (تیمارداری) مڈوائفری (دایہ گری) ڈاکٹری اور حفظان صحت کی تعلیم عورتوں کے لیے بدرجہ اتم ضروری چیز ہے، اور خواہ کیسے ہی اعلیٰ مرتبہ کی عورت کیوں نہ ہو اس کو بھی زندگی میں متعدد مرتبہ ان باتوں کے جاننے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔"

اس کے بعد ایک نہایت ہی اہم مطلب کی طرف توجہ دلائی ہے جو تمام ملک کے لیے مستحق غور وفکر ہے:۔

"گورنمنٹ آف انڈیا ہر سال ایک معقول رقم حفظان صحت پر خرچ کرتی ہے، لیکن اس سے کس طرح اصلی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے جب کہ عورتیں حفظان صحت کے اصول سے ناواقف ہوں، اور کیوں کر ممکن ہے کہ جب تک مکان، لباس غذا، اور اسی طرح کے دوسرے امور میں ان اصول کو نہ اختیار کیا جائے، کسی گورنمنٹ یا حکومت کی تدابیر مفید ہو سکتی ہیں۔"

انھوں نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

"کسی جگہ کا ہیلتھ ڈپارٹمنٹ (محکمۂ حفظان صحت) سڑکوں، کوچوں، اور گلیوں کی صفائی تو کرا سکتا ہے، کنوؤں، چشموں، وغیرہ کی نگرانی رکھ سکتا ہے، اشیاء و اجناس خوردنی کی اچھائی اور برائی کو دیکھ سکتا ہے، لیکن مکان کے اندر

کی غلاظت، اور پانی کی حفاظت، غذا کے پکانے، اور رکھنے کا انتظام کیوں کر کر سکتا ہے؟ ہر ایک جگہ شفا خانے کھولے جاتے ہیں، لائق ڈاکٹر مقرر ہوتے ہیں، میڈیکل ڈپارٹمنٹ (محکمہ طبی) عمدہ قسم کی ادویہ مہیا کرتا ہے، لیکن یہ کس طرح ممکن ہے کہ گھروں میں تیمار داری کا بھی انتظام کرے؟ صدہا مریض شفقت کرنے والی ماؤں، محبت کرنے والی بیٹیوں، دلسوز بہنوں، اور ہمدرد بیویوں کے ہاتھوں محض تیمار داری سے نابلد ہونے کے باعث سخت سے سخت تکالیف اٹھاتے اور لب گور پہنچ جاتے ہیں۔"

یہ سچ ہے کہ ہندوستان کا بجٹ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے اور گورنمنٹ سب سے زیادہ کم جس کام پر روپیہ خرچ کرتی ہے وہ تعلیم اور حفظان صحت ہے، اور یہ بھی سچ ہے کہ ہندوستان کی میونسپلٹیاں یوروپین کوارٹرز کی صفائی کا جس قدر اہتمام کرتی ہیں، دیسی آبادی کا نہیں کرتیں، تاہم میں نے اکثر اس بات کو سوچا ہے کہ کیا یہ صرف گورنمنٹ ہی کا قصور ہے یا آبادی کا بھی؟

اصل یہ ہے کہ جو لوگ صاف اور تندرست رہنا چاہتے ہیں، انھیں اس سے کوئی شے نہیں روک سکتی. گورنمنٹ قوانین نافذ کر دے گی اور میونسپلٹی راستوں کو صاف رکھے گی، لیکن ہمارے دماغ میں صفائی کا حس کون پیدا کرے گا؟ یہ چیزیں وسائل و معاون ہیں لیکن اصل کار نہیں۔ جب تک ہم خود صفائی کے لیے ویسے ہی مضطرب نہ ہوں گے جیسے کہ انگریز ہیں، اس وقت تک نہ تو ہماری سڑکیں صاف رہ سکتی ہیں، اور نہ ہمارے گھروں میں حفظ صحت و صفائی کے اصول پر عمل ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج ملک میں اصلاح اور عمل کا جو ہنگامہ بپا ہے، اس کے شور و غل میں بہت سے حقیقی کاموں کی صدائیں دبی جا رہی ہیں۔

کسی قوم کے صحیح معنوں میں شائستہ ہونے کے لیے اس کی معاشرتی حالت اور تربیت منزلی کو جس درجہ دخل عظیم ہے، اس کا ہر شخص اعتراف کرتا ہے، لیکن کتنے ہیں جو اس راہ کے ابتدائی کاموں کو بھی واقعیت کے ساتھ انجام دے رہے ہیں؟ ہماری زندگی کا یہ حال ہے کہ ہم نے یورپ سے وہ لباس تو سیکھ لیا ہے جو بہت قیمتی، بہت خوش قطع، اور بہت شاندار ہے۔

یقیناً ہم جب کبھی بازار میں سے گذرتے ہیں یا کسی جلسے میں نظر آتے ہیں، تو از سر تا پا مجسمۂ تہذیب و مدنیت ہوتے ہیں، لیکن اگر وہی شخص جو ہمیں کچھ دیر پہلے اس شان تہذیب آرا میں دیکھ چکا ہے، ہمارا تعاقب کرے اور گھر کے اندر کی زندگی کو دیکھے، تو بد نظمی و بد سلیقگی، بد تہذیبی و بے ترتیبی، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اور کثافت و غلاظت کے آثار کے ساتھ، منزلی وحشت و حیوانیت کا ایک پورا نمونہ دیکھ کر متحیر رہ جائے گا۔

یہ میں عام لوگوں کی حالت نہیں بیان کر رہا ہوں بلکہ میرے سامنے ان تعلیم یافتہ، تہذیب و تمدن فرما، اور از فرق تا بہ قدم فرنگی مآب حضرات کی معیشت منزلی موجود ہے، جو ہمیشہ ملک کے افلاس مدنی پر نوحہ و بکا کرتے رہتے ہیں۔ بے شک ان میں بہت سے ایسے خواص و روٗسا یا اعلیٰ ملازمتوں پر پہنچے ہوئے اشخاص بھی ہیں، جنھوں نے انگریزی طرز معاشرت اختیار کر لی ہے، او[ر ا]ن کے مکان کا ڈرائنگ روم اور ڈائننگ ہال نہایت مکمل اور آراستہ ہے۔ لیکن اس سے کیا حاصل؟ کیوں کہ اگر اسی ڈرائنگ روم کے خوش منظر سواد سے نکل کر ان کے زنان خانے کی طرف قدم بڑھایئے تو پھر نظر آجائے کہ ان کی معیشت منزلی کی اصلی تصویر کیسی ہے؟

میں جو نئے تعلیم یافتہ حضرات کا ہمیشہ شاکی رہتا ہوں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی ہر گذشتہ خوبی کو ان سے دور پاتا ہوں، اور اس کی جگہ کوئی نئی خوبی مجھے نظر نہیں آتی۔ ہماری گذشتہ مشرقی معاشرت، اوضاع و اطوار، اخلاق و عادات، طریق بود و ماند، یہ سب کے سب انھوں نے ضایع کر دیئے۔ اخلاق و تمدن کے بعد مذہب کا نمبر آیا، اور جدید تعلیم و تہذیب کے مندر پر مذہب کی بھی قربانی چڑھائی گئی۔ خیر مضائقہ نہیں۔ خرید و فروخت کا معاملہ ہے اور متاع بے بہا ہاتھ آتی ہو تو دل و جاں تک کو اس کی قیمت میں لگا دیتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ دے کر وہ کون سی چیز ہے جو ہاتھ آئی؟

علم؟ نہیں۔ اخلاق؟ نہیں۔ تہذیب معاشرت؟ نہیں۔ ایک پوری انگریزی زندگی؟ نہیں۔ ایک اچھی مخلوط معاشرت؟ یہ بھی نہیں! پھر یہ کیا بدبختی ہے کہ جیب اور ہاتھ دونوں خالی ہیں؟

آینده و گذشتہ تمنا و حسرت ست
یکؔ "کاشکے" بود کہ بصد جا نوشتہ ایم!

انگریزی تمدن کی تقلید نے ایک معیشتی طوائف الملوکی پیدا کردی ہے لیکن اب تک کوئی زندگی پیدا نہیں ہوئی۔ انگریزی تہذیب کے معنی صرف کالر کی چمک اور پتلون کا بے شکن ہونا ہی نہیں ہے۔ ان کے گھر کی صفائی اور نظم و باقاعدگی، تقسیم ضروریاتِ حیات و مکان اور ضبط اوقات، تہذیبِ ذاتی اور حسن معیشت منزلی وغیرہ وغیرہ، یہ چیزیں ہیں، جنھوں نے ان کے گھر کو ایک بہشتِ حیات بنا دیا ہے۔ اس کے لیے وہ چند ظاہر فریب چیزیں مطلوب نہیں ہیں جو تمھارے جسموں اور زبانوں پر نظر آتی ہیں، کیوں کہ یقین کرو کہ ان میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اصلی چیز گھر کی باقاعدہ زندگی ہے، اور بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ہم میں محض تعلیم عمومی کی جگہ حقیقی تربیت ذاتی اور تہذیب شخصی پیدا ہو، یعنی ہر شخص اپنی ذات سے اپنی حیات و داعیات میں صفائی کے لیے مضطر، باقاعدگی کا خوگر، نظم و سلیقہ کا عادی، اور اپنے ہر کام میں جمال و حسن کار کا خواہش مند ہو جائے۔ اس راہ میں سب سے مقدم عورتوں کی تربیت نہ کہ محض تعلیم ہے۔ عورت ہی گھر کی اقلیم حیات کی ملکہ ہے، اور شہر کی خوش حالی و رونق شہریار کی قابلیت و لیاقت پر موقوف ہے:

ضائع آن کشور کہ سلطانش نیست

میں نے ہمیشہ ہندوستان کی تمام ان قوموں میں جو نئے تمدن کی راہ سے ترقی کرنا چاہتی ہیں، پارسیوں کی قوم کو سب سے زیادہ مستحق تعریف سمجھا ہے۔ انھوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ کالجوں کی ڈگریوں کی سند جیب میں، اور ایک عمدہ سوٹ جسم پر ڈال لیا، بلکہ اپنی سوشل لائف میں بھی یکسر تبدیلی کر دی، اور فوراً تمام قوم ایک منظم و باقاعدہ طرز معیشت اختیار کر کے یک رنگ و یک حالت ہو گئی۔ ہندوستان میں اگر کوئی دوسری جماعت اس وصف کے لحاظ سے پارسیوں کے بعد قابل تذکرہ ہے تو وہ صرف بنگال کے برہمو خاندان ہیں، اور میں اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ان کی معیشت منزلی اور قوموں کے لیے یقیناً موجب رشک ہے۔

عورتوں کی تعلیم کے لیے بڑا ہنگامہ مچایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وقت آگیا کہ انھیں

انگریزی زبان و علوم کی بھی تعلیم دی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں، دونوں کے لیے یکساں طور پر تحصیل علوم والسنہ کا دروازہ باز رکھا ہے، اور اصولاً میں کوئی وجہ نہیں پاتا کہ عورتوں کے لیے کسی خاص زبان یا علم کی تحصیل ناجائز بتلائی جائے۔ لیکن اصول دوسری چیز ہے اور وقت و گرد و پیش کے حالات دوسری چیز ہیں۔ اگر عورت نے انگریزی زبان سیکھ لی تو کیا ہوا، اور نہ سیکھی تو کیا ہوا؟ اصلی چیز تربیت اور گھر کی معیشت کے نظم و ادارہ کی قابلیت ہے، اور وہ کسی خاص زبان کے جاننے پر موقوف نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ پچاس برس کی نئی ترقی و تعلیم نے جن لوگوں کو تہذیب و شائستگی کا ماتم گذار بنا دیا ہے، انھوں نے اس وقت تک اپنی عورتوں کو گھر کی زندگی درست کرنے حفظ صحت کے ضروری اصولوں پر عمل کرنے، اور تہذیب و صفائی اور نظم و سلیقہ سے زندگی بسر کرنے کے لائق بنا دیا ہے کہ اب ان کے ساتھ کتب خانے کے کمرے میں بیٹھ کر شکسپیئر اور گولڈ اسمتھ کے متعلق صحبت کرنے کے خواہش مند ہیں؟

میں تو کہتا ہوں کہ چھوڑیے انگریزی زبان کی تعلیم اور علم و ادب کے کسی اعلیٰ نصاب کو۔ خدارا اپنی عورتوں کو ابھی اتنا ہی سمجھا دیجیے کہ پان کی پیک سے گھر کی دیواروں اور صحن کے گوشوں کو لالہ زار نہ بنائیں، اور ڈرائنگ روم کی کرسیوں سے کتھ اور چونے کی انگلیاں نہ پونچھیں اور نیز یہ کہ بچوں کا علاج کرنے دیں تاکہ وہ ضائع ہونے سے بچ جائیں۔

جو مہذب اور فرنگی مآب بیکران تہذیب اس عفریت پان کے خونریز حملوں سے اپنے گھر، اپنے لباس، اور اپنے سامان کی حفاظت نہ کر سکیں، ان کے لیے یہ بحث چنداں ضروری نہیں ہے کہ عورتوں کو انگریزی پڑھائی جائے یا نہ پڑھائی جائے۔

اصل یہ ہے کہ ابتدا سے ہماری تعلیم کی بنیاد ہی ٹیڑھی پڑ گئی ہے اور اسی میں اب عورتوں کو بھی گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ محض یونیورسٹیوں کی تعلیم و تربیت نفس و جسم کے لیے بیکار ہے، اور تہذیب و شائستگی دیکھا دیکھی اور محض تقلید کے ایک بہیمی ولولہ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ میرا رونا اخلاق اور مذہب کے بلند و اعلیٰ خصائل کے لیے نہیں ہے۔ میں تو تعلیم یافتہ لوگوں کو تہذیب و شائستگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی عاری پاتا ہوں۔ اگر ان کا مایۂ ناز انگریزوں کی تقلید ہے

تو خدا کے لیے پوری اور کامل تقلید کریں۔ ایک شخص نہایت قیمتی انگریزی لباس سے ملبوس ہے، چھری اور کانٹے سے کھانے کا شائق، لیکن کھانے کے ضروری آداب و تہذیب سے اس درجہ عاری کہ میز پر کے دوسرے لوگوں کو اس کی وجہ سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ گھر میں جائیے تو ایک گوشہ بھی صاف بیٹھنے کے لیے میسر نہیں۔ جب حالت یہ ہے تو پھر انگریزی تقلید کو کیا کہیے اور اس سے حاصل کیا؟

اب اس کا علاج ایک ہی ہے، یعنی ملک کو تہذیب معاشرت اور حفظان صحت کی خاصۃ تعلیم دینا، اور علی الخصوص عورتوں کی تعلیم و مطالعہ کے لیے اس قسم کی کتابوں کا مرتب کرنا۔

تمام ملک کو شکر گذار ہونا چاہیے سرکار عالیہ بھوپال ادامہا اللہ بالعز والاقبال کا جنھوں نے "تندرستی" نامی کتاب اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر مرتب فرمائی، اور گو اس موضوع پر اردو میں پہلے بھی بعض رسائل لکھے گئے ہیں، مگر جن مستند ذرائع، کامل مطالب، بہتر ترتیب، اور عمدہ زبان و عبارت میں یہ کتاب مرتب ہوئی ہے، اس کے لحاظ سے بلاشبہ اردو میں اولین کتاب ہے۔

کتاب تین بابوں میں منقسم ہے۔ پہلا باب حفظان صحت کی ضروری ہدایات پر مشتمل ہے اور مختلف سرخیوں کے نیچے ضروریات ستہ، اور مکان، لباس، غسل و حمام، ورزش، استراحت وغیرہ کے متعلق تمام ضروری معلومات جمع کی ہیں۔

دوسرا باب متعدی امراض اور ان کے حفظ و دفع کے متعلق ہے۔ اس میں طاعون، ہیضہ، چیچک، پیچش وغیرہ کو علٰحدہ علٰحدہ بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا باب تیمار داری کے عنوان سے ہے اور در اصل کتاب کا اہم حصہ یہی ہے۔ اس میں متعدد عنوانات ہیں، اور ہر عنوان کامل غور و فکر کے بعد لکھا گیا ہے۔ مریض کا کمرہ، دوائیں، لباس، صفائی، غسل، ٹکور، پلٹس، پلسٹر، جونکیں لگانا، فصد، مسہل، مالش، غذا، بعض انگریزی غذاؤں کی ترکیب، ڈس انفیکٹ کا طریقہ، غرضکہ تمام ضروری امور بہ تفصیل تمام بیان کیے گئے ہیں۔

اس قسم کی کتابوں کے لیے جن کا مقصد عام مطالعہ ہو، سب سے بڑا مسئلہ زبان اور

طرزِ عبارت کا ہوتا ہے۔ طبی مسائل میں بعض مطالب پیچیدہ ہوتے ہیں، اور جب تک ان کو اس طرح نہ بیان کیا جائے کہ بغیر کسی مدد کے خود بخود قاری سمجھ لے، اس وقت تک کتاب کا نفع کامل و عام نہیں ہو سکتا۔

"تندرستی" اس اعتبار سے ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس کی عبارت نہایت سلیس اور صاف ہے۔ عربی و انگریزی الفاظ سے معرا ہے، اور سہل زود فہم طریق تفہیم و درس مطالب کے لیے ایک مثال سمجھی جا سکتی ہے۔

ضرور تھا کہ انگریزی اسمار و اصطلاحات طبیہ آئیں۔ بعض انگریزی غذاؤں اور دواؤں کا ذکر کرنا بھی ناگزیر تھا، مگر اس کے لیے تمام کتاب میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ ہر انگریزی لفظ کا ترجمہ یا متن یا حاشیہ میں دے دیا ہے، اور اگر نام و اصطلاحات ہیں تو انھیں انگریزی حروف میں بھی لکھ دیا ہے تاکہ صحیح تلفظ کے ساتھ بولی جائیں، اور بر وقت ان اشیار کے حصول میں غلط تلفظ سے اشتباہ نہ پیدا ہو جائے۔

یہ کتاب دفتر "ظل السلطان" بھوپال کو دے دی گئی ہے تاکہ اس کی قیمت سے تعلیم ڈاکٹری کے وظائف دیے جائیں اور یہ نفع مزید ہے۔ قیمت مجلد کی ۱۳۔ آنہ ورنہ ۸۔ آنہ ہے۔ ہر اس شخص کا جو اردو زبان میں لکھی ہوئی عبارت پڑھ لے سکتا ہے، فرض ہے کہ اس کتاب کو منگوائے، پڑھے، اور اپنے گھر میں رکھے۔ علی الخصوص لڑکیوں کے لیے تو اس کا درس و مطالعہ مثل فرائض دینیہ و شرعیہ کے ہے:

یاایھا الذین آمنوا ! قوا انفسکم و اھلیکم نارا !!

(الہلال: ۲۱ جنوری سنہ ۱۹۱۴ء)

افادہ

قیمت سالانہ ۲۔ روپیہ مع محصول۔ سول لائن۔ آگرہ

یہ اردو کا ایک جدید ماہوار رسالہ ہے جو نہایت نفیس کاغذ اور عمدہ چھپائی کے ساتھ گذشتہ نومبر سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ جناب حاجی نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب اس کے مدیر اور ایڈیٹر ہیں۔ غالباً مقصد اشاعت یہ ہے کہ ملک میں جو تعلیمی اور سیاسی کام ہو رہے ہیں ان پر ماہوار بحث کی جائے، اور اس کے علاوہ "دوسرے قسم کی بھی سوشیل، مارل، اور تاریخی مضامین،، شایع کیے جائیں۔

نواب صاحب اردو کے قدیمی اہل قلم ہیں جب کہ اردو کے لکھنے والے بہت کم تھے۔ اور نہ اس قدر رسائل و اخبار نکلتے تھے۔ علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں عرصے تک ان کے مضامین نکلے ہیں اور مشہور رسالہ "معارف،، کے بھی وہ نہ صرف مالک تھے بلکہ ایڈیٹری میں بھی شریک تھے۔ امید ہے کہ ان کی ایڈیٹری میں یہ نیا رسالہ ترقی کرے گا، اور دیگر اہل قلم بھی ان کی اعانت کریں گے۔

نومبر کا نمبر بطور نمونے کے شایع کیا گیا ہے اس لیے اس میں صرف وہ مضامین جمع کر دیے ہیں جو بعض اخبارات میں شایع ہوئے تھے مگر دسمبر کے نمبر میں متعدد مستقل مضامین ہیں اور پہلا مضمون جو ایجوکیشنل کانفرنس کے متعلق ہے، نہایت مفید نقد و مشورہ پر مشتمل ہے اور ارباب کار کے لیے قابل توجہ، بشرطیکہ وہ توجہ کرنا چاہیں۔

نواب صاحب کے سیاسی افکار و آراسے آج کل بڑا طبقہ قوم کا مخالف ہے اور یہ امر بھی آشکارا ہے کہ وہ الہلال کے کاموں سے خوش نہیں، تاہم میں یہ کہنے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتا کہ نواب صاحب جس استقلال اور یک رنگی سے اپنے سیاسی عقائد پر قائم ہیں، اور جس

غیر متزلزل لب و لہجہ میں ہمیشہ اپنے خیالات ظاہر کرتے رہتے ہیں، میں اپنے عقیدے میں ایسے نہایت تعریف و تحسین سمجھتا ہوں۔

زمانے کے خیالات یکسر پلٹ گئے ہیں اور وقت کے طوفان نے بڑے بڑے محکم ستونوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا دیا ہے۔ جو لوگ پچھلی صحبتوں کے مشہور رکن سمجھے جاتے تھے اور کل تک اپنے گذشتہ اصولوں کا وعظ کر رہے تھے، انھوں نے بھی زمانے کا رنگ دیکھ کر بالآخر اپنی جگہ چھوڑی، اور زیادہ نہیں تو نئے خیالات و عقائد کی طرف دو چار قدم تو ضرور بڑھ آئے، مگر تاہم لوگ دیکھ رہے ہیں کہ نواب صاحب ممدوح اپنے خیالات پر اسی استحکام و استواری سے قائم ہیں جس طرح گذشتہ عہد میں تھے، اور ہر موقعہ پر بلا تامل اور بلا خوف تحقیر و تضحیک اپنی قدیمی رائے ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

لوگ ہمیشہ ان کے خیالات کی مخالفت کرتے ہیں اور شاید ہی کسی شخص کے سیاسی خیالات کو اس درجہ عام طور پر مذموم سمجھا گیا ہو، جس قدر نواب صاحب کی تحریرات کو۔ عموماً ان کی تحریرات کو حکام کی خوشامد اور انتہا درجہ کی خوشامد سے تعبیر کیا جاتا ہے، تاہم وہ اس کی کچھ پروا نہیں کرتے اور اپنے خیالات برابر ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

میں نے کسی قدر تفصیل سے اس امر کو اس لیے لکھا کہ میں ان کے استقلال میں آج کل کے لوگوں کے لیے ایک بڑی عبرت پاتا ہوں۔ ان کو خوشامد اور غلامی کا الزام دیا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کاش آج کل کے مدعیان حریت کی آزادی میں بھی ویسا ہی استقلال غیر متغیر اور استقامت محکم پیدا ہو جائے، جس قدر ثبات و یک رنگی نواب صاحب کی خوشامد اور غلامی میں ہے۔

اگر ایسا ہو تو پھر مصیبتوں کا خاتمہ ہے۔ یاد رکھو کہ کفر ہو یا ایمان، پہلی چیز استقامت ہے، اور ایمان نفاق آلود سے ثبات کفر بہر حال بہتر ہے:

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبیست سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایمان ہم!

اس حریت کے ادعا کو لے کر کیا کیجیے جس میں ایک ادنیٰ سی آزمایش کی بھی تاب نہ

ہو؛ ولللہ درالشاعر:

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

میں جانتا ہوں کہ جمودِ فکر اور استقامت رائے، دو مختلف چیزیں ہیں، اور جس طرح ثباتِ رائے، ایک عمدہ جوہر اخلاقی ہے، اسی طرح طلبِ حق اور اعتراف گمرہی بھی بنیاد ہدایت وسعادت ہے۔ لیکن اگر ایک شخص کو اپنی غلطی محسوس نہیں ہوتی اور اس لیے اپنی غلط رائے پر صداقت سے قائم ہے، تو اس کی رائے کی تو پوری سختی سے تغلیط کیجیے، مگر ساتھ ہی اس کی استقامت کی پوری فیاضی سے تعریف بھی کیجیے، اور بن پڑے تو اپنے حق کے قیام کے لیے اس کے باطل کے ثبات سے سبق لیجیے۔

اگر افادہ کو تمام اردو اخبار و رسائل اور قومی کاموں پر انتقاد و بحث کے لیے مخصوص کر دیا جائے تو یہ بہت بہتر ہوگا، کیوں کہ اس قسم کا کوئی اردو رسالہ ملک میں نہیں ہے۔

چھپائی لکھائی اور ضخامت کے اعتبار سے قیمت نہایت کم ہے اور امید ہے کہ لوگ اس کی قدر دانی میں بخل نہ کریں گے کیوں کہ ملک میں سنجیدہ رسائل کی ضرورت شدید ہے، اور ان کے سیاسی آرا سے ہم لوگوں کو اختلاف ہو تاہم رسالے کے دیگر حصص کے فوائد میں تو کلام نہیں۔

(الہلال: ۲۸ جنوری ۱۹۱۴ء)

رباعیات عمر الخیام

(ایک نیا امریکن ایڈیشن)

قسط اول

پچھلے دنوں بعض اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ رباعیات عمر الخیام کا ایک نیا ایڈیشن امریکہ میں مرتب ہوا ہے اور عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ ولایت کی پچھلی ڈاک میں اس کے تفصیلی حالات آگئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نیویارک کی ایک بہت بڑی پبلشر کمپنی جان مارٹن اس ایڈیشن کو چھاپ رہی ہے، اور متعدد خصوصیات اس میں ایسی جمع کی گئی ہیں جن کی وجہ سے یورپ اور امریکہ کے "ادبار عمر بیین"[1] اس کی اشاعت کا نہایت دلچسپی سے انتظار کر رہے ہیں۔

(مرقعات و رسوم)

اس ایڈیشن کی ایک بڑی خصوصیت انتہا درجہ کا جمال طباعت اور حسن صورت ہے۔

---

[1] "ادبار عمر بیین" سے مقصود یورپ اور امریکہ کے ارباب ادب و شعر اور صاحبان فلسفہ و حکمت ہیں جو اپنے تئیں عمر خیام کی طرف نسبت دیتے ہیں، اور اپنے خیالات و ادبیات میں بالکل اس خراسانی حکیم کے پیرو و مقلد ہو گئے ہیں۔ کچھ ضرور نہیں کہ وہ مستشرق (اورینٹلسٹ) اور فارسی داں بھی ہوں۔ ایسے بھی ہزارہا شعراء و ادباء اس حلقہ میں داخل ہیں جنھوں نے محض فزجیرالڈ یا اس سے کمتر درجہ کے مترجمین کے ذریعہ خیام کے خیالات سے واقفیت حاصل کی، مگر رباعیات کے انداز بیان و اسلوب شاعری سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اسی رنگ اور اسلوب پر نظم و نثر فخریہ لکھنے لگے۔

عمر خیام کے اس وقت تک بے شمار پر تکلف ایڈیشن مختلف شکلوں میں نکل چکے ہیں۔

لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ اس نئے ایڈیشن کے تکلفات کے آگے تمام پچھلے ساز و سامان ہیچ نظر آئیں گے۔ علی الخصوص اس کے مرقعات اور تصاویر و رسوم جو دلدادگان خیام کی نظر افروزی کے لیے ہر تیسرے چوتھے صفحہ کے بعد لگائے گئے ہیں۔

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن دوست

چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد!

یہ خیالی تصویریں جو آج کل پر تکلف ادبی تصنیفات کے ساتھ چھاپی جاتی ہیں، غالباً عام قارئین کرام کو ان کی قدر و قیمت کی صحیح اطلاع نہ ہوگی۔ مشاہیر گذشتہ کی تصنیفات کے متعلق خیالی تصاویر بنانا ایک مستقل فن ہے، جس کے بڑے بڑے ماہرین و مشاہیر ہیں۔ جب کبھی کوئی نادر کتاب چھپتی ہے تو اس کے لیے ان کی خدمات محفوظ کر لی جاتی ہے۔ وہ ایک ایک تصویر کے لئے سو سو پاؤنڈ اجرت پیشگی لیتے ہیں۔

پچھلے دنوں انگلستان کے ایک کلب نے الف لیلہ کے ترجمہ برٹن کا نہایت پر تکلف ایڈیشن دس جلدوں میں طبع کیا تھا، اور اس کے بڑے بڑے مناظر حسن و عشق و خلافت و سلطنت کی تصویریں یورپ کے مشہور ماہرین فن رسوم خیالیہ سے بنوا کر شامل کتاب کی تھیں۔ میں نے یہ نسخہ دیکھا ہے۔ پوری کتاب میں اقلاً پچاس مرقع ضرور ہوں گے۔ لیکن فی مرقع ۳۰ پونڈ سے لے کر دو سو پونڈ تک اجرت دی گئی تھی۔

"رباعیات عمر خیام"، بھی پچھلی چوتھائی صدی سے بڑے بڑے مصوران مشہورہ کے فکر و تخیل کا ایک معرکۃ الآرا موضوع رہا ہے۔ عمر خیام کی صورت کا موزوں تصور کرنے اور اس کی رباعیات کے مطالب کو تماثیل مصورہ کی اشکال میں پیش کرنے کے لیے بڑے بڑے مصوروں نے اپنے اپنے جوہر کمال دکھلائے۔ علی الخصوص موجودہ یورپ کے مشہور ترین مصور مسٹر گلبرٹ جیمس کی تصویریں عدیم النظیر تسلیم کی گئیں، جن میں سے بعض کو فیز جیرالڈ کے ترجمہ میں آپ نے جا بجا دیکھا ہوگا۔

لیکن امریکن ایڈیشن کے شائع کرنے والوں کا دعوا ہے کہ انھوں نے تمام پچھلے نسخوں سے

بہتر مرقعات کا اہتمام کیا ہے۔ اب تک اس قدر روپیہ اور دماغ خیام کی تصویروں پر کسی نے صرف نہیں کیا۔ یورپ کے مشہور مصوروں کی خدمات کئی سال پیشتر سے حاصل کرلی گئی تھیں، اور فارسی شاعری کی ادبی تاریخ اور اس عہد کے عجمی حکما و شعرا کے لباس و اشکال کا تاریخی مواد اس غرض سے بہم پہنچایا تھا کہ مصوروں کو بہتر سے بہتر اور اقرب سے اقرب تصور قائم کرنے میں ان سے مدد ملے۔

ان تصویروں میں خود خیام کی تصویریں نہایت اعلیٰ درجہ کی کھینچی ہیں، اور کامل الفن اشخاص معترف ہیں کہ تمام پچھلی تصویروں سے زیادہ مشرقی اور خیام کے خیالات کے لحاظ سے کامل تر قیافہ کے مطابق ہیں۔ ان کے علاوہ سو سے زاید رباعیوں کے بھی مرقع کھینچے ہیں اور رنگین اور مطلا و مذہب طبع کیا ہے۔

ان مرقعات میں سے چار تصویریں "اسفیر" لنڈن نے شایع کر دی ہیں۔ ان کی نقل ہم بھی شایع کرتے ہیں۔ ان کے نیچے انگریزی میں رباعیات کا ترجمہ بھی درج تھا۔ تین ترجموں کی اصل رباعیاں یاد آگئیں اور درج کر دی گئیں۔ لیکن ایک ترجمہ اس درجہ مبہم، مختصر اور کسی بہت ہی غیر معروف رباعی سے تعلق رکھتا ہے جس کی اصل رباعی کا سرسری طور سے پتہ نہ لگ سکا اور صرف اتنی سی بات کے لئے رباعیات کی ورق گردانی کون کرتا؟

(مکمل ترجمہ)

ایک بہت بڑی خصوصیت اس ایڈیشن کی یہ ہے کہ اس میں عمر خیام کی تمام رباعیات کا مکمل انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے۔ وہ مشہور فزجیرالڈ کے ترجمہ کی طرح نظم میں ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ فارسی شاعری کے اس سب سے بڑے قادر الکلام مترجم کا نسق و انداز اور اسلوب خاص ہر رباعی کے ترجمہ میں ملحوظ رہے۔ حتیٰ کہ اس کی جمع و تہذیب کرنے والوں کا خیال ہے کہ ایک ناواقف شخص فزجیرالڈ کی نظم میں اور اس کے تراجم میں بمشکل فرق کر سکے گا۔

ہم نے بعض اردو جرائد میں دیکھا کہ اس نسخہ کی اشاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے اسے پہلا مکمل ترجمہ خیال کیا ہے۔ حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس سے پیشتر ایک بڑی

تعداد میں ایسے ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں جن میں فِز جیرالڈ کی ترجمہ کردہ رباعیات کے علاوہ کئی سو اور رباعیوں کا ترجمہ بھی نظم و نثر میں دیا گیا ہے، اور بعض میں تو یہ التزام کیا ہے کہ رباعیات کے جس نسخہ کو اصل قرار دیا، اس کی تمام رباعیوں کا ترجمہ بھی ساتھ ساتھ درج کر دیا۔ اس قسم کے مترجموں میں گارنر، ہنری دے فرناں، نیکولس اور علی الخصوص پروفیسر والانیتن ژدکفسکی کا نام قابل ذکر ہے، جس نے نسخۂ کلکتہ اور نسخۂ سینٹ پیٹرزبرگ کی تمام رباعیات کا ترجمہ کر دیا ہے۔

ان میں سے آخر الذکر مستشرق کا نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ اس نئے امریکن ایڈیشن سے پہلے یہی ایڈیشن سب سے آخری ایڈیشن سمجھا جاتا تھا۔ اس میں سینٹ پیٹرزبرگ کے نسخہ کی ۳۴۰ رباعیوں کا مکمل ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔ دیگر نسخوں کی مترجمہ رباعیوں کو شامل کر لیا جائے تو انگریزی ترجمہ شدہ رباعیوں کی تعداد پانچ سو تک پہنچ جاتی ہے۔

اسی طرح فرانسیسی، دنمارکی، المانی (جرمن) اور روسی زبان میں بھی ۷۵ سے ۴۰۰ تک رباعیوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

لیکن یہ ترجمے وہ قبولیت حاصل نہ کر سکے جو "مغربی خیام" یعنی فِز جیرالڈ کی ۷۵ رباعیوں کے لیے قدرت نے مخصوص کر دی تھی۔ اس کی انگریزی رباعیوں میں جو سلاست و عذوبت اور حسن ترکیب و تاثر بیان پایا جاتا ہے، اس کے سامنے یہ تمام ترجمے اس طرح نظر آتے ہیں جیسے کسی اصلی فارسی نظم کے مقابلے میں اس کا بے اثر لفظی ترجمہ۔ فارسی شاعری اور مغربی ادبیات اصولاً اس درجہ باہم مختلف ہیں کہ دونوں میں تباین و تضاد کا ایک اطلانتک بہہ رہا ہے۔ اسے عبور کرنے میں صرف فِز جیرالڈ ہی کی ہمت کام کر گئی، اور وقت و حالات، جدت و حداثت، اتحاد خیالات و مشرب، نیز جماعت کے وقتی انفعال و تاثر نے ایک مرتبہ اس کا ساتھ دے دیا۔ یہ باتیں ہمیشہ اور ہر شخص کے حصے میں نہیں آسکتیں۔

یہی سبب ہے کہ یہ تراجم ایک ادبی یا حکیمانہ مترجمہ ذخیرہ سے زیادہ وقعت حاصل نہ کر سکے۔ ان سے صرف یہ کام لیا گیا ہے کہ غیر فارسی داں ادبا و عمربین نے ان کے ذریعہ

بقیہ رباعیوں سے بھی واقفیت حاصل کرلی۔ ان سب میں مسز یورین اور ہانفیلڈ کے بعض تراجم نسبتاً زیادہ فصیح و دلنشین تھے۔ جنھوں نے کیمبرج کے نسخہ کی بعض رباعیات کا ترجمہ ۱۸۹۰ء میں کیا تھا، اور "مجلس عمر خیام" لنڈن نے ۱۸۸۲ء میں شایع کیا تھا، تاہم نہ تو وہ فیز جیرالڈ کی طرح عشاق خیام کے وسیع حلقہ میں کوئی ادبی محبوبیت حاصل کرسکیں، اور نہ انگریزی ادبیات میں ایک داخلی جزو شعری کی طرح انھیں قبولیت ہوئی۔ ان کا شمار بھی "ترجمہ" میں ہے البتہ اعلیٰ قسم کے تراجم ہیں۔

پس یہ کہنا تو صحیح نہیں کہ نیا امریکن ایڈیشن رباعیات کا پہلا مکمل ترجمہ ہے۔ البتہ اس کی خصوصیت یہ بتلائی جاتی ہے کہ ان کے تراجم میں فیز جیرالڈ کے اتباع بلکہ ہمسری کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ فیز جیرالڈ کا اصلی کارنامہ "سوئن برن" کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"وہ یورپ کا خیام ہے۔ اس نے ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ انگریزی میں خیام کی روح شعری کو متشکل و متمثل کردیا ہے۔ اگر خیام انیسویں صدی کے اندر انگلستان میں پیدا ہوتا اور فردوسی کی جگہ چوسر کی زبان میں (یعنی انگریزی میں) رباعیات کہتا، تو یقیناً وہ ایسی ہی ہوتیں جیسی کہ اس مغربی خیام کے دل پر مشرقی فیضان لاہوتی سے القا ہوئی ہیں۔"

اس ایڈیشن کے مرتب کرنے والوں کا دعوا ہے کہ فیز جیرالڈ نے ایسا ترجمہ صرف ۷۵ رباعیوں کا کیا ہے۔ لیکن یہ خیام کی تمام رباعیوں کا ویسا ہی مکمل ترجمہ ہوگا۔

ادبا و شعرائے عمر بیین کی ایک بہت بڑی امریکن و انگریزی جماعت نے ترجمہ کا کام باہم بانٹ لیا تھا۔ چند اصول مقرر کرلیے تھے جن کی پابندی کی ہر مترجم کوشش کرتا تھا۔ ان میں سے اکثر مترجم ایسے ہیں جنھوں نے ایک ایک رباعی کا ترجمہ ایک ایک ششماہی میں کیا ہے۔ پہلے ترجمہ کیا جاتا پھر تصحیح ہوتی۔ پھر قدیم ترجموں سے مقابلہ ہوتا۔ اس کے بعد نظم کیا جاتا پھر عرصے تک خود ناظم اپنے مختلف اوقات و اثرات میں کمال استغراق شعریت و شرقیت کے ساتھ پڑھتا، خاص خاص نغمات مخصوصۂ خیام میں گاتا، اور دوسروں سے لے میں پڑھوا کر سنتا۔ جب اس طرح اس کی کیفیت و وجدان کے ذوق و تاثیر کی طرف سے پورا پورا

اطمینان ہو جاتا اور کئی کئی مرتبہ ترمیم و اضافہ ہو چکتا، تو پھر تمام مترجمین کی صحبت میں پیش کیا جاتا اور کئی کئی دن تک محافل و مجالس شعرائے عمریین میں اس پر بحث و مذاکرہ ہوتا۔ جو لوگ باہر کے شریک کار ہیں، ان کے پاس لکھ کر بھیج دیا جاتا، اور اس طرح تمام رائیں جمع کی جاتیں۔

ان تمام مراحل کے بعد مترجمہ رباعی داخل کتاب کی جاتی۔ اس وقت بھی کہ کتاب چھپ رہی ہے اور عنقریب نکلنے والی ہے، تغیر و تبدل اور اصلاح و نقد کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

هر نظم گوہری کہ بیاد تو گفتہ ام
دل رخنہ کردہ و جگر خویش سفتہ ام

(رباعیات کی تعداد)

رباعیات عمر خیام کی اصلی تعداد کا مسئلہ اب تک مختلف اور ایک حد تک مشتبہ ہے مختلف نسخے جو یورپ اور مشرق میں پائے جاتے ہیں، باہم تعداد میں مختلف ہیں۔ مصنفین یورپ نے ان کی تحقیقات و کشف حقیقت کے لیے بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔

سب سے زیادہ قدیم نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا ہے جو آٹھویں صدی ہجری کے اواخر کا لکھا ہوا ہے۔ یعنی عمر خیام کی وفات سے تقریباً تین سو برس بعد کا۔ اس میں ۴۰۲ رباعیاں ہیں۔ میں نے یہ نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی میں ممبر ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ نکلوانا چاہا تو معلوم ہوا کہ لنڈن گیا ہے اور غالباً مسٹر اڈورڈ براؤن نے منگوایا ہے۔ اب عرصے سے بالکل مفقود الخبر ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں گیا؟ اس کے ساتھ گلستان کا وہ قیمتی نسخہ بھی مفقود الخبر ہے جو عالمگیر اورنگ زیب نے نہایت اہتمام سے نقل کرایا تھا، اور اس نسخہ کی نقل تھا جو خود شیخ سعدی کے لڑکے کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر بروکلمین اور سرجان گلکرسٹ نے گلستاں کے ایڈیشن اسی نسخہ سے نقل لے کر شایع کیے تھے۔

میں نے کئی بار سکریٹری کو توجہ دلائی کہ برٹش میوزیم سے خط و کتابت کر کے تحقیق کیا جائے۔ وہیں یہ نسخے گئے ہیں اور رکھ لیے گیے ہیں۔ لیکن غریب ایشیاٹک سوسائٹی کو اس کی جرأت

کب ہو سکتی ہے کہ انڈیا آفس کے زیر اثر کتب خانے سے کسی طرح کا مطالبہ کرے؟

اس کے بعد سر گور اوسلی کا نسخہ ہے۔ وہ ایران سے لائے تھے، اور اب آکسفورڈ کے کتب خانہ بولڈن میں محفوظ ہے۔ اس کا سال کتابت ۱۴۶۱ مسیحی ہے۔ یعنی مصنف سے ساڑھے تین سو برس بعد کا نسخہ ہے۔ انگریزی مترجمین و مولفین نے زیادہ تر اسی نسخہ پر اعتماد کیا ہے مگر اس میں صرف ۱۵۸ رباعیاں ہیں۔

تیسرا قدیمی نسخہ سینٹ پیٹرز برگ کے کتب خانہ کا ہے جس کا عکس پروفیسر والانیتن ژوکفسکی (VALENTIN ZHUKOVSKI) نے باعانت بیرن ایکٹر روزین معلم السنۂ مشرقیہ پیٹرز برگ یونیورسٹی شایع کیا ہے، اور جو نہایت اعلیٰ ترین خط نستعلیق میں فی صفحہ ایک رباعی کی ترتیب سے لکھا گیا ہے، اس کے کاتب نے اپنا نام "سید علی الحسینی" لکھا ہے۔ سال کتابت ۱۴۹۹ مسیحی ہے۔ یعنی سر گور اوسلی کے نسخہ سے تقریباً چالیس برس بعد۔ اس میں ۳۴۰ رباعیاں ہیں۔

چوتھا نسخہ بانکی پور کے کتب خانے کا ہے۔ پانچواں کیمبرج یونیورسٹی کا جو کسی قدیم طہرانی نسخہ کی نقل ہے۔ اول الذکر میں ۶۰۴ رباعیاں ہیں۔ دوسرے نسخہ میں ۸۰۰۔

ان کے علاوہ بے شمار حدیث العہد قلمی نسخے یورپ کے مختلف کتب خانوں میں ہیں جن میں سے بعض کی مندرجہ رباعیات پندرہ پندرہ سو تک شمار کی گئی ہیں۔ پروفیسر براؤن نے ایک قدیم نسخہ طہران میں دیکھا تھا جس میں ۷۷۰ رباعیاں تھیں اور عہد صفویہ کے درمیانی زمانے کا نوشتہ تھا۔ مگر جو نسخہ طہران میں چھپا ہے، اس میں صرف ۲۳۰ رباعیاں ہیں۔ اسی کی نقل بمبئی میں بار بار چھپ چکی ہے۔

ایک اور نسخہ پرانا رباعیات کا ہے جس کا ذکر مجھ سے آج کل کے ایک روسی سیاح و مستشرق موسیو امواتوف نے کیا ہے جو انھوں نے اصفہان میں دیکھا تھا اور اس کی نقل لے لی تھی۔

یہ نقل آج کل میرے ہی پاس ہے اس میں ۱۴۰ رباعیاں ہیں اور عام ترتیب ابجدی کی جگہ ابتدا میں حمد و نعت کی تمام رباعیاں جمع کر دی ہیں۔ اس کے بعد بغیر کسی ترتیب

کے باقی رباعیاں درج کی ہیں۔ سیاح موصوف کا بیان ہے کہ اصلی نسخہ ۸۰۰ ہجری کا نوشتہ ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ نسخہ سب سے زیادہ قیمتی ہے اور سر گور اوسلی کے نسخہ سے بھی زیادہ اس کو قیمتی سمجھنا چاہیے۔ اسی خیال سے میں دیگر نسخوں سے اس کا مقابلہ کر رہا ہوں۔ چند رباعیاں اس میں بالکل نئی ہیں۔

(الہلال: ۲۴ جون ۱۹۱۴ء)

رباعیات عمر الخیام

(ایک نیا امریکن ایڈیشن)

قسط دوم

ان رباعیوں کی تعداد اختلاف نے یہ مسئلہ پیدا کر دیا کہ اصلی رباعیوں کی تعداد کتنی ہے؟ اور یہ جو زیادہ سے زیادہ تعداد تک رباعیاں موجود ہیں، یہ سب کی سب عمر خیام ہی کی ہیں یا نہیں؟

مستشرقین عمریین کا عرصہ تک یہی خیال رہا کہ جس قدر زیادہ رباعیاں نکلتی آتی ہیں، وہ سب کی سب عمر خیام ہی کی ہیں، اور جن نسخوں میں تعداد کم ہے، وہ یا تو ناقص ہیں یا کسی شخص نے اپنے مذاق کے مطابق اصل دیوان رباعیات کا انتخاب کر لیا ہے۔ چنانچہ جب کبھی کسی زیادہ تعداد والے نسخہ کی ان میں سے کسی کو اطلاع ملی تو وہ اس درجہ خوش ہوا، گویا علوم و حکمت قدما کا کوئی گم شدہ ذخیرہ ہاتھ آگیا ہے، یا برباد شدہ مدرسۂ اسکندریہ کے کتب خانے کا سراغ مل گیا ہے۔

غالباً سب سے پہلے مستشرق بزرگ و شہیر، پروفیسر والانتین ژوکوفسکی (VALENTIN ZHUKOVSKI) نے اس غلطی کو محسوس کیا، اور ایک محققانہ رسالہ عمر خیام پر لکھ کر ثابت کیا کہ بڑی تعداد رباعیات منسوبۂ خیام کی الحاقی ہے، اور بعد کو کسی غلط فہمی کی وجہ سے خیام کی جانب منسوب ہو گئی ہے۔

یہ رسالہ سن ۱۸۹۷ء میں "المظفریہ" کے رسائل کے ساتھ سینٹ پیٹرز برگ سے چھپ کر شایع ہوا۔ اس وقت سے یورپ اور امریکہ کے عمریین و خیامین کے حلقہ میں الحاقی رباعیات کی تحقیق و تجسس کی ایک نئی کاوش پیدا ہو گئی ہے۔

پروفیسر ژوکوفسکی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ۸۲ رباعیاں پیش کی ہیں جو

مختلف معروف و متداول نسخوں میں خیام کی طرف منسوب ہیں، حالاں کہ خیام سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔ وہ دراصل شیخ عطار، خواجہ حافظ، مولانائے روم، شیخ عبداللہ انصاری اور انوری وغیرہ متوسطین شعرائے ایران کی ہیں۔

اس مضمون کو پڑھ کر مستشرقین فرنگ نے الحاقی رباعیات کی تلاش شروع کر دی۔ پروفیسر براؤن نے ۱۲ رباعیوں کا اور ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق اس وقت تک کل ۱۰۱ رباعیاں الحاقی ثابت ہو چکی ہیں۔ (ان نئی الحاقی رباعیوں کی تفصیل کے لیے پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران (LITERARY HISTORY OF PERSIA) باب ۱۲ صفحہ ۲۴۶ سے ۲۵۹ تک دیکھیے۔)

اس میں شک نہیں کہ پروفیسر والانتین ژدکوفسکی کی تلاش و جستجو قابل تحسین ہے، لیکن افسوس کہ مستشرقین کے بعض دیگر مباحث خیامیہ کی طرح یہ بحث ہمارے لیے چنداں قیمتی نہیں ہو سکتی اور نہ اس بارے میں پروفیسر مذکور کی تحقیقات کے ہم محتاج تھے۔

اگر وہ مشرق کے کسی ایسے شخص کی اعانت بہم پہنچا لیتے جو فارسی شاعری کا تھوڑا سا بھی ذوق رکھتا ہے اور عام تذکروں اور دیوانوں کا مطالعہ کر چکا ہے، تو اس مشکل کی قیمت چند سرسری لمحوں کی نظر سے زیادہ نہ نکلتی اور بغیر کسی زحمت اور تلاش کے اس سوال کا حل مل جاتا بلکہ جس حصہ تک وہ حل کر سکے ہیں، اس سے کہیں زیادہ وسیع و تشفی بخش ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ الحاقی کلام کا سوال صرف خیام ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک حد تک عام ہے۔ الحاقی منسوبات کی عام بلا سے شاید ہی کوئی مشہور شاعر بچا ہو۔ اس درجہ سے بھی نظر بلند تر کیجیے اور عام طبقہ مشاہیر و اعاظم مصنفین و متوسطین کو دیکھیے تو ہر علم و فن کے ارباب کمال اسی مصیبت سے دوچار نظر آئیں گے۔ آج کتنی ہی تصنیفات ہیں جو امام ابوحنیفہ، جابر طرطوسی، ابن قتیبہ، امام غزالی اور معشر فلکی، فخر الدین رازی، بوعلی سینا، معلم ثانی، ابن عربی، محقق طوسی وغیرہ سے منسوب ہیں جن کی مصنفات پر عہد اور ہر حصۂ عالم میں معروف و متداول رہیں، لیکن نظر دقت سے دیکھا جائے تو از سر تا پا الحاقی ہیں۔

ناصر خسرو، فردوسی، خواجہ حافظ، جلال الدین رومی، حکیم سنائی سب کے دیوانوں کا

یہی حال ہے۔ لیکن جن لوگوں کو ایک ادبی ذوق بھی فارسی شاعری اور مختلف اعصار ادب وغیرہ کے متعلق حاصل ہے اور شعر و شاعری کے اندر مخصوص اور افکار مختصہ کے متعلق نظر و بصیرت رکھتے ہیں، وہ بغیر کسی زحمت و کاوش کے بادل نظر اندازہ کر لیتے ہیں کہ کس قدر کلام اصلی ہے اور کس قدر بعد کو رواۃ، کاتبین اور سہو و التباس ناقلین یا بعض وسائس و اغراض شخصیہ و دینیہ سے ملا دیا گیا ہے۔

علی الخصوص عمر خیام کے متعلق تو یہ مسئلہ کچھ بھی دشوار نہ تھا۔ اس کا انداز بیان و نظم ایک خاص طرز کا ہے۔ وہ اپنے افکار شعریہ و حکمیہ میں بعض ایسی خصوصیات رکھتا ہے جو چند رباعیوں کے مطالعہ کے بعد ہی نمایاں ہو جاتی ہیں اور کسی دوسرے کا کلام سامنے آکر دھوکا نہیں دے سکتا۔

تصوف و اخلاق سنائیؒ اور عطار، دونوں کہتے ہیں۔ رزم و جنگ فردوسی اور نظامی دونوں نے لکھا ہے۔ خمریات اور جام و صراحی حافظ کی طرح سب کے ہاتھ میں ہے۔ تغزل اور راز و نیاز عشق سے سعدی کی طرح خسرو اور نظیری کی طرح عرفی کی کائنات شعر بھی معمور ہے، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ گو ان سب کا لباس اور شکل و صورت ایک ہے لیکن ادائیں تو خاص خاص ہیں جو کسی طرح صاحبان نظر سے چھپ نہیں سکتیں۔

من انداز قدت را می شناسم!

میں تو کہتا ہوں کہ اس شخص کے لیے فارسی شاعری کے ذوق و مطالعہ کا دعوا حرام ہے جس میں اتنی ادا شناسی بھی نہ ہو کہ صرف کلام سن کر ایک شاعر کو اس کے دوسرے ہم رنگ و ہم فکر شاعر سے تمیز کر لے۔

ہر کہ خواہد میل دیدن، در سخن بیند مرا!

علاوہ بریں جو رباعیات عمر خیام کے نام سے منسوب کی گئی ہیں ان کا بڑا حصہ فارسی کے تذکروں اور دیوانوں میں دیگر شعرا کے نام سے موجود ہے جس کے لئے کسی بڑے علمی تجسس کی ضرورت نہیں۔ تذکرہ دولت شاہ، مراۃ الخیال، آتش کدہ، مجمع الفصحا، والہ داغستانی اس درجہ کی مشہور کتابیں ہیں کہ معمولی درجہ کے فارسی دانوں نے بھی انھیں ضرور دیکھا ہوگا۔

ان میں وہ رباعیات دوسروں کے کلام میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ شیخ بو علی سینا کی یہ رباعی ہمارے یہاں بچہ بچہ کی زبان پر ہے :

در دہر چو یک منی و آن ہم کافر
پس در ہمہ دہر یک مسلماں نبود

لیکن بعض نسخوں میں اسے عمر خیام کے نام سے لکھ دیا ہے۔ ہمارے یوریپین محققوں کو یہ ثابت کرنے کے لئے بڑی ہی جانکاہ محنتیں گوارہ کرنی پڑیں کہ یہ رباعی خیام کی نہیں بلکہ شیخ کی ہے۔

اسی طرح شیخ جامی کی لوائح، لمعات، شرح ابن فرض وغیرہ رسائل میں جو رباعیات وحدۃ الوجود وغیرہ کے متعلق بکثرت درج کی گئی ہیں، ان کو بھی بعض ناقلین نے خیام کی طرف منسوب کر دیا۔ پروفیسر ژوکفسکی نے ان کی تحقیقات میں کئی سال بسر کر دیے اور سینٹ پیٹرزبرگ کے کتب خانے کی ایک ایک کتاب دیکھ ڈالی، حالاں کہ شیخ جامی کے یہ رسائل نہایت عام اور کثیر الاشاعت ہیں، اور بمشکل کوئی فارسی داں شخص ایسا ہوگا جس نے انھیں نہ پڑھا ہو۔

شیخ جامی کے بعد سب سے زیادہ التباس شیخ الاسلام انصاری کی بعض رباعیات میں ہوا ہے۔ شیخ کی مناجاتوں کا عام انداز یہ ہے کہ وہ پہلے نثر مسجع میں ایک دعا مانگتے ہیں یا رحمت و رافت الٰہیہ سے مخاطبہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک قطعہ یا رباعی مناسب مقام ایراد کر کے دوسرا مخاطبہ شروع کرتے ہیں۔ یہ رباعیات اکثر خود انھیں کی ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں دوسروں کی بھی لے لیتے ہیں۔ سوز و گداز، والہانہ طلب و سوال، عاشقانہ شکوہ و شکایت اور عارفانہ و حکیمانہ حکم و مقابلہ، شیخ الاسلام کی نظم و نثر کی خصوصیات ہیں مگر یہی باتیں ایک دوسرے فلسفیانہ رنگ میں خیام کے ہاں بھی ہوتی ہیں۔ عوام کو اس میں دھوکا ہوا اور شیخ کی بہت سی رباعیاں خیام کے نام سے نسخوں میں لکھدیں۔ رباعیات خیام کا جو نسخہ آج کل ایران اور ہندوستان میں رائج ہے، اس میں بھی شیخ کی متعدد رباعیات مل گئی ہیں۔

(ایک نئی دریافت)

یہاں تک تو ہم نے ان الحاقی رباعیات کے متعلق لکھا ہے جن کی تعداد ایک سو سے

متجاوز ہے اور جن کا بڑا حصہ پروفیسر والانتین ژوکفسکی نے تحقیق کیا ہے، مگر اب ہم مستشرقین یورپ کی تحقیقات سے الگ ہو کر خود نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ خیام کی مسلمہ رباعیات میں سے جن کو تمام ناقدین و محققین و عمریین نے خیام کے مخصوص نوادر فکر و شعر میں سے شمار کیا ہے، ایک رباعی یہ ہے:

من بندۂ عاصیم، رضائے تو کجاست
تاریک دلم، نور و صفائے تو کجاست
ما را تو بہشت اگر بطاعت بخشی
آں بیع بود، لطف و عطائے تو کجاست

اکثر تذکرہ نویسوں نے بھی اس رباعی کو خیام کے ترجمہ میں لکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایک نہایت ہی بلند ترین مقام عبودیۃ و تذلل و اعتراف ہے جو بہتر سے بہتر طریقے، اور موثر سے موثر انداز میں شاعر نے اس میں بیان کیا ہے۔ اس کا حقیقی لطف صرف انھیں صاحبان حال و کیفیت کو حاصل ہو سکتا ہے جو اس مقام تک پہنچ چکے ہیں۔

قرآن حکیم میں برادران یوسف (علی نبینا وعلیہ السلام) کا عزیز مصر سے یہ کہنا اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہے:

جئنا ببضاعة مزجىٰة فاوف لنا الكيل وتصدق علينا ان الله يجزى المتصدقين

ہم ایک ناقص پونجی لے کر تیرے سامنے حاضر ہو رہے ہوئے ہیں، لیکن تو اس کے نقص اور کمی کو نہ دیکھ بلکہ اپنے لطف و کرم پر نظر رکھ کر ہمیں بھرپور غلہ دیدے۔ یہ خرید و فروخت اور برابر کا معاوضہ نہیں ہے، تجھ سے بطور صدقہ و عطیہ کے طلبگار ہیں۔ خدا صدقہ دینے والوں کو اس کا بدلہ ضرور ہی دیتا ہے۔ "بدریوزہ گری آمدہ ایم نہ بہ تجارت"

وقال المتنبی:

وهبت على مقدار كفى زماننا
ونفسى على مقدار كفك يطلب

لیکن خیام کے مطالعہ کرنے والے تعجب سے سنیں گے کہ یہ رباعی خیام کی نہیں ہے بلکہ

عارف مشہور و جلیل سلطان ابو سعید ابو الخیر قدس اللہ سرہٗ کی ہے۔

سلطان ابو سعید کا کلام نظم غالباً ایک جگہ جمع نہیں کیا گیا۔ صرف تذکروں میں چند رباعیات مل جاتی ہیں۔ ان مشہور رباعیات میں یہ رباعی نہیں ہے۔ اسی لیے کسی شخص کو اس کی نسبت شبہہ پیدا نہیں ہوا۔ لیکن شیخ کے حالات و مقامات میں ایک نہایت ضخیم کتاب ان کے پوتے شیخ محمد بن المنور بن ابو سعید نے لکھی ہے جس کا نام "اسرار التوحید فی مقامات الشیخ ابی سعید" ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے یکایک اس رباعی پر میری نظر پڑ گئی۔ اس کے مصنف نے تصریح کر دی ہے کہ ایک خاص وجدانی حالت میں یہ دو بیتی شیخ کی زبان پر جاری ہوئی تھی۔

اگر مزید تلاش کی جائے تو عجب نہیں کہ اسی طرح الحاقی رباعیات کے متعلق غیر متوقع معلومات جمع ہو جائے۔

(نیا امریکن ایڈیشن)

اس تفصیل سے مقصود یہ تھا کہ نئے امریکن ایڈیشن کی منتخبہ رباعیات کی مقدار پر نظر ڈالی جائے۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس میں ۱۷۸ رباعیوں کا ترجمہ دیا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایڈیشن کے مولفین کے نزدیک اصلی مقدار اتنی ہی ہے مگر ہم کو یقین ہے کہ اس میں ایک بڑی تعداد الحاقی رباعیات کی ہو گی۔ کیوں کہ اگر مرگورا وسلی کے نسخے کی تمام رباعیات اصلی تسلیم کر لی جائیں، جب بھی اتنی تعداد اصلی رباعیات کی ثابت نہیں ہوتی۔

بہر حال ہمیں تکمیل و اشاعت کا انتظار کرنا چاہیے۔ مطالعہ کے بعد صحیح رائے قائم کی جا سکے گی۔

(الہلال: یکم جولائی ۱۹۱۴ء)

چارلس اسٹوارٹ پارنل

آج کل آئرلینڈ کی آزادی و استقلال کی تحریک اپنی آخری منزلوں سے گذر رہی ہے۔ اس موقعہ پر اگر اس تحریک کے ایک مشہور لیڈر کا تذکرہ کیا جائے تو غالباً وقت اور موسم کے خلاف صحبت نہ ہوگی علی الخصوص ایسی حالت میں کہ اس کے اندر انسانی حیات کے بہت سے دلچسپ اور مطالعہ طلب اسرار کا انکشاف ہو۔

اس تحریک کے مشہور لیڈروں میں ایک جانباز شخص "چارلس اسٹوارٹ پارنل" تھا۔ اس نے مسٹر گلیڈاسٹون کے زمانے میں بے انتہا شہرت حاصل کی جب کہ وہ آئرلینڈ کا "ہوم رول بل" ترتیب دے رہے تھے۔ موجودہ تحریک کی زندگی اسی کی جانفروشیوں کا نتیجہ ہے۔

آئرش تحریک کے تمام ہواخواہوں میں اس کی پرستش کی جاتی تھی اور تمام قوم اس کی مطیع و منقاد تھی۔

لیکن اس کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آگئے جن کی وجہ سے پارنل یکایک نظروں سے گر گیا، اور خود اس نے بھی محسوس کیا کہ اس کی عملی قوت شکست کھا کے اسے چھوڑنا چاہتی ہے۔ بلکہ اس سے بدظن ہوگئی، عزت و اطاعت کی جگہ حقارت و تذلیل کے ساتھ اس کا ذکر ہونے لگا۔ خود انھیں لوگوں نے ساتھ چھوڑ دیا جن کے استقلال کے لیے اس نے اپنی زندگی خطرات و مہالک میں ڈال دی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آئرلینڈ کا مسئلہ کامیابی سے قریب تر ہو کر پھر گر گیا اور آئرش تحریک بیس سال کے لیے پیچھے رہ گئی۔ یہ مسلم ہے کہ اگر مسٹر پارنل کو اس کی قوم نے چھوڑ نہ دیا ہوتا تو آئرلینڈ کی موجودہ حالت اب سے ایک چوتھائی صدی پہلے ہو رہتی۔

یہ انقلاب جو ایک محبوب القلوب اور پرعظمت و رفعت زندگی میں ہوا اور جس سے

آفتاب شہرت کو عین نصف النہار کے وقت گہن لگ گیا، اس کی علت صرف ایک عورت کی نگہ ساحر کی افسوں طرازی تھی، جس کے آگے آئرلینڈ کو استقلال دلانے والے دماغ نے اپنے تئیں بالکل بے دست و پا پایا، اور ہمت و عزائم کے جس تاج و تخت کو حکومت کی سطوت و ہیبت مرعوب نہیں کر سکتی تھی، وہ ایک متبسم چہرے، ایک شگفتہ چشم و ابرو، ایک پر از عشق نگہ ناز، اور ایک دلستاں و شکیب ربا صدائے مترنم کے آگے اضطراب و تزلزل سے کانپنے لگا۔

اس عورت کا نام "مسز اوشی" تھا۔ مسٹر اوشی ممبر پارلیمنٹ کی بیوی تھی مگر پارنل کے لیے اس نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا، اور جب عرصے تک خفیہ تعلقات رہ چکے تو طلاق لے کر صرف اسی کی ہو گئی۔ یہ حالات جب مشہور ہوئے تو لوگوں کو سخت افسوس ہوا اور افسوس نفرت و حقارت بن کر یکایک تمام ملک میں پھیل گئی۔

حال میں خود "مسز اوشی" نے ایک نہایت دلچسپ کتاب مسٹر پارنل کے متعلق شائع کی ہے جس کا نام "پارنل، اس کے عشق کا افسانہ، اور اس کی سیاسی زندگی" ہے۔ یہ کتاب نہایت دلچسپ ہے۔ علی الخصوص اس لیے کہ گویا ایک صید و نخچیر کی سرگذشت ہے۔ جو خود صیاد کی زبان سے نکلی ہے۔ اور اس خصوصیت کے اعتبار سے شاید اپنے رنگ میں ایک ہی ہو۔ فرہاد و شیریں، لیلیٰ مجنوں، جمیل و سلمیٰ اور قیس و لبنیٰ کا عہد گیا،

دور مجنوں گذشت و نوبت ماست!

اب اس عہد کے مجنوں و فرہاد مسٹر پارنل جیسے عشاق ہیں، اور لیلیٰ و شیریں کا حجلۂ حسن مسز اوشی جیسی نکتہ شناس اور کتاب طراز فتنہ گروں کو ملا ہے۔ پہلے عشق کی داستانیں صرف زبان عشق ہی سے سنی جاتی تھیں۔ اب زبان حسن ان کی ترجمانی کرے گی۔ یہ گویا فرہاد کی سوانح عمری ہے جو اس عہد کے شیریں قلم سے نکلی ہے۔

یارب کس آشنائے کسے نکتہ داں مباد!

سب سے بڑی خصوصیت جو اس سوانح عمری میں ہے، وہ ایک سیاسی زندگی کا حیات عشقیہ سے آمیز ہونا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حسن و عشق کی خود فراموشانہ صحبتوں میں آکر ایک پولیٹیکل لیڈر کا کیا حال ہوتا ہے؟

بظاہر یہ دونوں چیزیں متضاد نظر آتی ہیں مگر حقیقت میں سرچشمہ دونوں کا ایک ہی ہے۔
ایک نہ ہو جب بھی عشق کی روح تو وہ جوہر حیات ہے جو ہر جسم کو زندہ کر دیتا ہے،

یکے دواست بدار الشفا میکدہ ہا

زہر مرض کہ بنالد کسے شراب دہند!

کراموِیل نے بھی محبت کے نمود کی تقدیس کی، اور اٹلی کے پاک نژاد "میزینی" کی نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ ایک زلف صد کمند تھی، جس کی لٹوں میں کبھی کبھی اس کی بے مہر انگلیاں محبت سے شانہ کیا کرتی تھیں۔ نپولین جب ماسکو کو تباہ کر کے واپس آرہا تھا تو اس نے کہا:

"میں عشق سے انکار نہیں کرتا"!

لیکن پارنل کی مصیبت دوسری قسم کی تھی۔ وہ گر کر اٹھ نہ سکا حالانکہ جو گر کر اٹھتے ہیں وہ ان سے زیادہ بے خطر دوڑتے ہیں جنھیں راہ کی ٹھوکروں کی خبر نہیں۔

وہ ہمیشہ کے لیے بندھ گیا۔ یہی حملہ کیوپڈ کا ناقابل دفاع ہوتا ہے، حالانکہ جنگل کی عورتوں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھ کر کہا تھا: "تو اپنی کمان کھینچ مگر زنجیر سے کام نہ لے"۔[1]

عشق چوں بر سر کسی حملۂ بے داد آرد

اوش قوت بگریختن از پا ببرد

"گرافک" لنڈن کے مشہور انتقاد نگار مسٹر فلپ گبس نے اس کتاب پر نہایت دلچسپ ریویو لکھا ہے اور بعض قابل غور اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ہم اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں:

"پارنل" اپنے وقت میں آئرش تحریک کا سب سے بڑا لیڈر تھا۔ اس وقت کسی کو اس کا وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ایک عورت کے لیے تمام دنیا کو کھو بیٹھے گا؛ یا یہ کہ ایک قوم جو انتہائی قانون شکنی کے لیے اٹھی ہے، اپنی قومی قسمت کے ایک نہایت ہی نازک

---

[1] یونانی علم الاصنام میں کیوپڈ عشق کا دیوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں عشق کا تیر و کمان ہے۔ ایک منظر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ محل میں حسین عورتوں نے سب سے پہلے اسے دیکھا اور فریاد کی کہ کمان کھینچ مگر زنجیر سے کام نہ لے۔

وقت میں اپنے ایک ہی لیڈر کو صرف اس لیے چھوڑ دے گی کہ اس نے ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کی تھی"

مگر ایسا ہی ہوا۔ پارنل سے لغزش ہوئی۔ عشق کے حملے کو وہ نہ روک سکا۔ اس کے متبعین نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آئرش تحریک کم از کم بیس سال پیچھے ہٹ گئی۔

مسز "اوشی"، ہی وہ عورت ہے جس کے لیے پارنل نے اپنا مستقبل برباد کیا، اس لیے اس کے اس قول کو ضرور باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ (یعنی مسز اوشی) "پارنل کی روح کے خلوتکدوں میں اس کی پیچیدہ تاریکیوں اور نظر خیرہ کن روشنیوں کے باوجود داخل ہوئی۔"

پارنل ایک دراز قامت، عمیق و سنجیدہ چشم، مسرور مگر خوشنما چہرہ انسان تھا۔ تعجب یہ ہے کہ جب وہ ان لوگوں سے ملتا تھا جن کو اس سے ہمیشہ سابقہ پڑتا تھا، تو اس وقت بھی وہ معمولی انسان نہیں معلوم ہوتا تھا۔

اس میں اپنے انگریزی آباؤ اجداد کی نخوت اور مغرورانہ کم سخنی تھی جس کی تائید اس کے حیا پرور اور ذکی الحس مزاج سے ہوتی تھی، لیکن ساتھ ہی اس کے کیریکٹر میں چیلنج کا انداز تھا۔ آئرش قوم کی روح پوری طرح اس میں موجود تھی۔ اس کی گہری اداسی اس کی وہم پرستی، اس کا کسانوں کا سا اندر ہی اندر سلگنے والا جذبہ کیسا عجیب تھا! وہ رومن کیتھولک نہ تھا، مگر ان کی اسرار پرستی کی ہوا اسے لگ گئی تھی۔ تاہم وہ ان کے عقائد سے اتفاق نہ کر سکا۔

مسز اوشی لکھتی ہیں: "اس کا (پارنل کا) ارادہ سخت خود مختار تھا۔ وہ جب ایک دفعہ کسی کام کا ارادہ کر لیتا تھا تو پھر نہ کسی کو اس میں مداخلت کرنے دیتا تھا، اور نہ کسی شے کو اپنی راہ میں حائل ہونے دیتا۔"

مسز مذکور بتلاتی ہیں کہ "جب اس کی جماعت میں سے کوئی شخص اسے روکتا تھا، تو وہ کس طرح خوفناک سفید ہو جاتا تھا؟ اور کس طرح اس شخص کو اپنی جماعت سے ایک ایسی خاموشی اور سردمہری کے ساتھ نکال دیتا جو اس کے ارادہ کی اندیشیدہ مخالفت سے پیدا ہوتی۔"

اس کا قول تھا کہ "جب تک میں لیڈر ہوں، لوگ میرے آلات اور اوزار ہیں۔ اگر انھیں یہ منظور نہیں تو چلے جائیں۔" اس نے بے رحمی سے ان "آلات" کو اپنی خطرناک سرد طاقت سے ڈھال کے سدراہ ہونے اور ڈرانے کا وہ معرکہ شروع کیا جو انگریزی ارباب سیاست کے لیے ایک "خواب پریشان" ہوگیا۔

لیکن یہ اتفاق دیکھو کہ جب وہ اپنے سے باہر اس طرح محشر بپا کر رہا تھا تو خود اپنے اندر عشق کا شکار ہوگیا۔ اسی کی داستان الم کا دفتر کیتھرائن اوشی نے اپنی کتاب میں کھولا ہے۔ پہلے کیتھرائن کیپٹن اوشی آئرش ممبر پارلیمنٹ کی بیوی تھی۔ اس نے پارنل، بہت لمبے دبلے، اور خوفناک زرد رو پارنل کو سب سے پہلے "پیلس یارڈ" میں دیکھا۔ وہ لکھتی ہے:

"اس نے (پارنل نے) ایک تبسم کے ساتھ میری طرف سیدھی نظروں سے دیکھا۔ اس کی شعلہ فشاں آنکھوں نے کچھ ایسے حیرت انگیز شوق کے ساتھ دیکھا تھا کہ معاً میرے دماغ میں اس کی عجیب ہستی کا تصور پیدا ہوگیا۔ میں نے خیال کیا یہ شخص عجیب وغریب اور مختلف قسم کا ہے۔"

اسی وقت سے یہ معلوم ہونے لگا کہ ان دونوں میں بہت گہری ملاقات ہوگئی ہے۔ اس کے باوجود باقاعدہ مگر مخفی خط وکتابت بھی شروع ہوگئی ہے۔

۱۸۸۱ء میں جب پارنل کو خوف پیدا ہوا کہ اسے بغاوت کے جرم میں گرفتار کرلیا جائے گا، تو وہ ایک دن شب کو مسز اوشی کے مکان پر آیا اور اس سے اپنے تئیں چھپانے کی فرمائش کی۔

پارنل مسز اوشی کے ڈریسنگ روم میں دو ہفتہ تک چھپا رہا۔ مکان والوں میں سے کسی کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ البتہ نوکروں نے صرف اس قدر کہا کہ "بیوی (مسٹرس) پہلے جس قدر گوشت کھاتی تھیں۔ اب ڈریسنگ روم میں اس سے زیادہ کھانے لگی ہیں!"

مسز اوشی کے یہاں سے جب پارنل جانے لگا تو اس نے تمام سیاسی مراسلات مسز اوشی کے حوالے کردیں۔ مسز اوشی نے ایک مجوف کنگن بنوایا اور اس میں ان مراسلات میں سے دو مراسلتوں کو جو خاص طور پر اہم اور خطرناک تھیں، رکھ کر اپنے بازو پر پہن

لیا۔ یہ کنگن اسی طرح تین برس تک اس کے بازو پر بندھے رہے۔

مسز اوشی پارنل کے تمام رازوں کی محرم تھی۔ یہ اسی کا مکان تھا جہاں پارنل اپنی جماعت کے جلسوں کو چھوڑ کے آجایا کرتا تھا، اور گھنٹوں اس عجیب عورت کے ساتھ بیٹھتا رہتا تھا جس کو وہ اپنی زبان میں "ملکہ" کہتا تھا وہ بھی اسے اپنا "بادشاہ" کہتی تھی!

بارہا ایسا ہوا کہ وہ نہایت اہم جلسوں میں صرف اس لیے نہ جا سکا کہ اس "دلربا ملکہ" نے اسے اجازت نہ دی۔ آہ! وہ کس قدر ظالم تھی جب کہ اس انسان کو روک رہی تھی، جس کے جانے پر ایک پورے ملک کے مستقبل استقلال کا دارومدار تھا۔

مسز اوشی جب کبھی اسے لعنت وملامت کرتی تو وہ ہمیشہ یہ جواب دیتا کہ ملکہ! تم آئین بادشاہت سے واقف نہیں۔" نہ کبھی وجہ بیان کرے اور نہ کبھی معذرت کرے!"

اس کے ساتھ ہی ہنس کے (جو اس کے لیے عام طور پر ایک نادر الوقوع امر تھا) ان الفاظ کا اضافہ کر دیتا۔" اگر میں معذرت کی انسانی کمزوری سے بالاتر نہ ہوتا تو اپنی جماعت کو قائم نہ رکھ سکتا؟"

اس قصہ کا وہ حصہ بہت دلچسپ ہے جہاں مسز اوشی نے یہ بتایا ہے کہ وہ کیوں کر پارنل اور گلیڈسٹون میں ایک متوسط کی حیثیت سے کام کیا کرتی تھی اور کس طرح حسن وعشق سیاست اور قومی تحریک کا نامہ بر تھا؟

مسز اوشی کا دعوا ہے کہ اس محبت کے بارے میں وہ پارنل کو (جس نے اپنی تمام عمر ایک عورت کے لیے خطرہ میں ڈال دی) اور اپنے آپ کو (جس نے اپنے جاں نثار عاشق کے لیے شریف شوہر سے بیوفائی کی) ہرگز مجرم نہیں سمجھتی۔ اور وہ ان لوگوں کے نفاق کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے جو اس قصہ کے طشت از بام ہونے اور طلاق کے منظور ہونے کے بعد ان دونوں کی محبت کو برا کہتے ہیں۔ حالاں کہ وہ اس سے پہلے بھی ان کے باہمی تعلقات سے واقف تھے۔ مگر کبھی انھوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

(الہلال: ۲۲ جولائی سنہ ۱۹۱۴ء)

(۱)

معراج العقول

مفلس کی قسمت سے زیادہ اس شخص کی بدقسمتی پر افسوس کرنا چاہیئے جس کے پاس دولت کا کچھ نہ کچھ بقیہ موجود ہے، مگر وہ اس سے متمتع نہیں ہوتا۔

یہی حال آج تمام عالم اسلامی، اور علی الخصوص مسلمانان ہند کا ہے۔ وہ ہر چیز میں صرف اسی چیز کا ماتم کرتے ہیں جو جا چکی ہے، مگر جو کچھ موجود ہے اس سے خبردار ہونے اور کام لینے کا کسی کو ہوش نہیں۔ مذہب کو، علم کو، تمدن کو، اخلاق کو، معاشرت کو، غرضکہ حیات قومی کی جس شاخ کو دیکھیے گا یہی نظر آئے گا کہ مسلمانوں کی جیب اس قدر خالی نہیں ہے جس قدر ان کا ہاتھ بے خبر ہے۔

صرف اسی بات کو دیکھیے کہ ہندوستان سے علم و ارباب علم کے رخصت ہو جانے پر کس قدر آنسو بہائے جاتے ہیں، اور کس طرح ہمیشہ ماتم کیا جاتا ہے کہ علم و قلم کی صحبتیں برہم ہوگئیں؛ لیکن اس چیز پر کسی کی نظر نہیں پڑتی کہ علم و قلم کی آج بھی جو قابلیتیں موجود ہیں، وہ کس طرح ضایع کی جا رہی ہیں، اور ملک کی ناقدر شناسی اور بدامتیازی نے کس طرح انھیں مٹنے کے لیے گمنامی میں چھوڑ دیا ہے؟ کتنے ہی ارباب علم و فضل ہیں جن کا جوہر علمی آج صرف اس لیے رائگاں جا رہا ہے کہ ان کو امن کی ایک رات اور دل جمعی کی ایک صبح بھی نصیب نہیں۔ کتنے ہی ارباب قلم ہیں جو بہتر سے بہتر علمی خدمت انجام دے سکتے ہیں لیکن ان کی تمام قابلیت کچھ نہیں کر سکتی کیوں کہ اتنی استطاعت بھی نہیں رکھتے کہ ضرورت

علہ یہ کتاب نہایت اہتمام اور تکلف سے چھاپی گئی ہے۔ ۸۰ سو صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ قیمت پانچ روپیہ ہے اور خود مصنف سے "نونہرہ ضلع غازیپور" کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

کی چند کتابیں خرید سکیں۔ کتنے ہی صاحبان استعداد و فکر ہیں جن کے لیے اصلی مشغلہ علم و فن کا تھا لیکن ان کا سارا وقت اسمیں خرچ ہوتا ہے کہ :۔

چہ خورد بامداد فرزندم!

لوگ اس پر ماتم کرتے ہیں کہ جانے والے چلے گئے، مگر کسی کی آنکھ نہیں روتی کہ جو باقی ہیں ان کی خبر لیں۔

ایسے ہی ارباب علم و ذوق میں سے جناب مولانا سید مرتضیٰ صاحب نونہروی ہیں جن کی ایک تصنیف "معراج العقول" پچھلے دنوں شایع ہوئی ہے، اور جس کے مطالعہ کے بعد سطور مندرجۂ صدر کی ہر صاحب نظر تصدیق کر سکتا ہے۔

صاحب "معراج العقول" موجودہ عہد کے علمار شیعہ میں ایک ممتاز اہل نظر ہیں اور منجملہ ان مخصوص بزرگوں کے ہیں جن کو اجتہاد فکر، حریت رائے، اور اصابت فہم نے شاہراہ عام کی تقلید پرستیوں سے الگ کر دیا ہے، اور اس لیے نہ تو وقت کی مقبول عام صفوں میں ان کے لیے کوئی جگہ رہی ہے، اور نہ خود ان کو ہی ان صفوں میں جگہ پانے کی کوئی حسرت ہے۔ زمانے نے ہمیشہ ایسے لوگوں کے مقابلے میں ناقدردانی کا حربہ اٹھایا ہے، مگر انھوں نے بھی اپنی بے نیازیوں سے ہمیشہ اس کے سر غرور و جہل کو شکست دی ہے:۔

ناروابود بہ بازار جہاں جنس وفا
رونقی گشتم و از طالع دکان رفتم

صاحب معراج العقول مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کے زمانے میں بعہدۂ نظامت علوم و فنون، ریاست حیدرآباد دکن سے تعلق رکھتے تھے۔ انقلابات و تغیرات نے ورق الٹا تو اپنے وطن کا رخ کیا۔ ایک عرصہ سے وہیں عزلت گزیں ہیں اور بے نیازانہ و علم پرستانہ مشغول تصنیف و تالیف رہتے ہیں۔ زمانے کو اگر ان کے علم و فضل کی خبر نہیں ہے تو نہ ہو، مگر ان کو زمانے کی جہل پرستی اور خیرہ مذاقی کا حال اچھی طرح معلوم ہے:۔

زمرغان حرم در کام زاغاں طعمہ اندازد   مدار روزگار سفلہ پرور را تماشا کن

معراج العقول عربی کی ایک ضخیم کتاب ہے جو ۸۰۰ سو صفحوں پر ختم ہوتی ہے اور حسن طباعت کے متعلق اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ نامی پریس کانپور میں غیر معمولی اہتمام کے ساتھ چھاپی گئی ہے۔ کتاب کا موضوع کلام و الٰہیات ہے، اور جناب مصنف کے مطالعہ و نظر کا اصلی موضوع یہی ہے۔ ان مباحث کے لیے متاخرین نے زیادہ تر یہ روش اختیار کی تھی کہ کسی چیز کو بہ طور متن کے قرار دے کر اس کی شرح لکھتے تھے، اور اس ضمن میں تمام پیش نظر مباحث ایک ترتیب خاص کے ساتھ آجاتے تھے۔ صاحب معراج العقول نے بھی اسی کا تتبع کیا، اور مشہور دعا مشلول کو جو اسمار حسنیٰ کا مجموعہ ہے، شرح کے لیے منتخب کیا کلام و الٰہیات کے جتنے اہم مباحث ہیں، وہ سب کے سب مختلف صفات باری تعالےٰ عزاسمہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے اسمار حسنیٰ کی شرح لکھنے کے یہ معنی ہیں گویا کلام و مباحث الاہیۂ حکمیہ پر ایک جامع کتاب لکھ دی۔

افسوس کہ البلاغ کی محدود و مشروط صحبتیں تفصیلی تبصرہ کی متحمل نہیں، کتاب نہایت ضخیم ہے اور جن مباحث و مسائل پر مشتمل ہے ان میں ہر مسئلہ اس قدر وسیع اطراف بحث رکھتا ہے کہ جب تک تفصیل کے ساتھ نقد و تبصرہ نہ کیا جائے کتاب کی حیثیت واضح نہیں ہو سکتی۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ کتاب عربی میں ہے، یعنی اس زبان میں ہے جو مرحوم عرفی کے عہد میں بھی مخصوص بہ خواص تھی، اور "حدیث زیرلبی" ہی کے لیے موزوں سمجھی جاتی تھی :-

مدار صحبت ما بر حدیث زیرلبی ست
کہ اہل شوق عوام اند و گفتگو عربی ست

اور جب اس عہد کا یہ حال تھا تو ہمارے عہد کی نسبت تو سوال ہی بے کار ہے:

مجلس چو برشکست تماشا بما رسید!

پس اس کے سوا چارہ نہیں کہ سرسری اشارات پر اکتفا کیا جائے۔ سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ قابل ذکر خصوصیت جو اس کتاب کو موجودہ عہد کی بہترین مصنفات کا درجہ دیتی ہے، وہ اجتہاد فکر و استقلال رائے ہے جس کی روشنی کتاب

کے ہر مبحث میں نمایاں ہے۔ یہ وہ فضیلت عظمیٰ و مزیت کبریٰ ہے کہ اگر کتاب میں اور کچھ نہ ہوتا، اور آٹھ سو صفحوں کے اندر صرف ایک سطر بھی اس دولت عظمیٰ سے بہرہ ور ہوتی، جب بھی صاحب معراج العقول کے شرف و امتیاز کے لیے کافی تھا۔

خلاف رسم دریں عہد خرق عادت داں
کہ کارہائے چنیں از شمار بوالعجبی ست

قرآن حکیم کی تمام دعوت کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ "ما وجدنا علیہ اٰباءنا" اور "انا وجدنا اٰباءنا علیٰ امۃ وانا علیٰ آثارھم مقتدون" کے خلاف ایک یکسر صدائے احتجاج ہے جو دنیا سے اسکے سوا کچھ نہیں چاہتی کہ تقلید کی جگہ اجتہاد، اور جہل کی جگہ علم و برہان کو اپنا دستور العمل بنائے۔ لیکن صدیوں سے تمام عالم اسلامی کا یہ حال ہو رہا ہے کہ علم و فن کی کوئی شاخ نہیں جو تقلید اعمیٰ و اتباع بغیر بصیرت کے استیلائے ضلالت سے بچی ہو، اور جس تقلید کے متعلق بالاتفاق سب نے فیصلہ کر دیا تھا کہ وہ جہل کا دوسرا نام ہے اور علم کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی کیوں کہ علم نام حصول دلیل کا ہے، اسی کا نام آج علم رکھا گیا ہے۔ درس و تدریس و تصنیف و تالیف میں منتہائے کمال یہ رہ گیا ہے کہ چند اقوال زید و عمر کے نقل کر دیے جائیں، اور جس راہ پر ایک بھیڑ چلتی ہوئی نظر آگئی ہے، اسی پر خود بھی گامزن ہو جائیں۔ کہ انا علیٰ آثارھم مقتدون!

جو روشنی بہ کلی گم ہو گئی ہے، اس کی ایک چھوٹی سی کرن بھی موجودہ عصر ظلمت میں کم از آفتاب نہیں۔ صاحب معراج العقول کی سب سے زیادہ ممتاز چیز یہی ہے۔ اور ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ حق کو نہ تو کسی ایک مصنف کی ملکیت میں دے دیتے ہیں اور نہ کسی مسئلہ کی صداقت و عدم صداقت کا معیار سنیت و شیعیت کو قرار دیتے ہیں۔ متعدد مقامات میں انھوں نے صاحب عماد الاسلام اور علامہ مجلسی کے تشدد و تقشف پر پوری بیباکی کے ساتھ رد و طعن کیا ہے، اور متعدد مقامات میں جہاں وہ امام فخر الدین رازی کی تحسین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور اس سے بالکل بے پروا ہیں کہ کس شخص کا تعلق کس فرقہ سے ہے؟

متاخرین علمارِ شیعہ میں شیخ بہاء الدین عاملی کے بعد غالباً صاحب معراج العقول دوسرے شخص ہیں جنھوں نے تصوف کے متعلق انصاف و راستی سے کام لیا ہے۔

فریقانہ نزاعات اور تحزب و تمذہب کی عصبیت جاہلیت کے بحران نے صدیوں سے اعتدال مسلک کو گم کر دیا ہے، اور تقلید نے ہمتوں کو اس قدر پست کر دیا ہے کہ کسی شخص کو راہ حقیقت میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالےٰ صاحب معراج العقول کو جزار خیر دے جنھوں نے اس راہ میں قدم رکھا اور اجتہاد و استقلال فکر کے ساتھ اپنی سیاحت تحقیق ختم کی۔ افسوس کہ اصلی چیز مباحث الاہیہ و کلامیہ تھے۔ مثلاً بحث حسن و قبح اشیار و مسئلہ تعلیل و عدم تعطیل افعال واجب بالاعراض و مسئلہ علمیہ جزئیات مادیہ وغیرہ، لیکن ان پر بحث کرنے کے لیے کافی وقت اور گنجایش صفحات مطلوب اور اس سے میں مجبور رہوں۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ چوں کہ فاضل مصنف نے متاخرین شیعہ سے اختلاف کیا ہے اس لیے میں کتاب کو مستحق تحسین سمجھتا ہوں، بلکہ میرے نزدیک کتاب کے بہترین مواقع وہ ہیں، جہاں انھوں نے مسائل کلامیہ پر بحث کرتے ہوئے اشاعرہ و معتزلہ کے مذاہب کا رد و قبول کیا ہے، اور متعدد مقامات پر اشاعرہ کے رد کرنے میں حق ان کے ساتھ ہے، اور میرا مسلک اشاعرہ و معتزلہ دونوں سے الگ ہے، والحمدللہِ علیٰ ذالک۔

آخر میں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب راجہ ابو جعفر صاحب رئیس فیض آباد کی اس علم پرستانہ فیاضی کا اعتراف کروں کہ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت کا سرو سامان کیا۔ موجودہ عہد کے رؤسا میں اس کی مثالیں نایاب ہیں، کچھ شک نہیں کہ راجہ صاحب ممدوح نے اپنے اس انفاق فی سبیل العلم سے ایک قابل صد تحسین نمونہ قائم کیا ہے۔

جناب مصنف کی متعدد تصنیفات اور علی الخصوص اس کتاب کی دوسری جلد ہے، جس کی اشاعت کا اب تک کوئی سر و سامان نہیں ہوا۔ افسوس اس عہد جہل پرور پر، اور صد افسوس اس عصر ضلالت اندیش پر، جس میں ایسے ارباب علم و نظر میں موجود ہوں

نگران کے بہترین اثرات علمیہ صرف چاندی کے چند سکوں کے نہ ملنے سے شایع نہ ہوسکیں۔ کیا اس وسیع ملک میں جہاں صدہا رؤسا و ارباب دولت موجود ہیں، اور جہاں متعدد بڑی بڑی اسلامی ریاستیں قائم ہیں، کوئی بھی نہیں جو علم کی بے کسی پر روے، اور ارباب علم کی کس مپرسی پر غمگین ہو؟ جو لوگ ہزاروں روپیہ نمایش ولہولعب اور اطاعت طواغیت حکومت میں ضایع کر رہے ہیں، کیا ان کی دولت میں علم اور خدمت علم کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے؟

(البلاغ: شمارہ ۱۲)

اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام

(یعنی اُردو ترجمہ)

"پرپوزڈ پولٹیکل اینڈ سوشیل ریفارمز انڈر مسلم رول"

مصنفہ

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی مرحوم

پر مولوی محمد اختر صاحب کا ریویو

اس کتاب میں علامہ مصنف نے بہ زبان انگریزی ۱۸۸۳ء میں ایک یورپین عالم ریورنڈ ملکم میکال کے اس اعتراض کی تردید میں کہ "مذہب اسلام مانع ترقی ہے" قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ سے نہایت عالمانہ طریق پر یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی روحانی، اخلاقی اور دماغی ترقی کا حامی، تغیر زمانہ کے ساتھ نئے تمدن و سیاست کا ساتھ دینے والا، اور زندہ ضروریات کے مطابق ہر قسم کے قوانین کی بنیاد بننے کی صلاحیت رکھنے والا مذہب ہے۔ اس کی فطرت جمود و خمود کے منافی ہے۔ اسی ضمن میں اسلام کے متعلق دوسرے یورپین مصنفین مثلاً سر ولیم میور، سوتھ اسمتھ، باڈاڈس ہیوبسیل وغیرہ کی غلط بیانیوں کی اصلاح بھی مشرقی اور مغربی حوالوں سے کی گئی ہے، اور صدہا اسلامی مسائل متعلق معاشرت و سیاست پر عالمانہ بحث کی گئی ہے۔

غرض کہ یہ کتاب اسلامی تمدن و سیاست کا خلاصہ ہے، اور اس میں وہ مسائل جمع کیے گیے ہیں، جن پر ہزارہا اسلامی کتب کے مطالعہ کے بعد بھی بہ مشکل عبور ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہنا بالکل مبالغہ سے خالی ہے کہ جو قیمتی معلومات اس مختصر کتاب میں جمع کی گئی ہیں وہ آج تک زبان اردو میں نہیں ملیں گی، جس کا ثبوت فہرست مضامین کتاب ہٰذا سے ملے گا۔

اس پر آشوب زمانہ میں جب کہ ہر طرف سے مسلمانوں کے تمدن و سیاست اور ان کے

ملکی و قومی اخلاق پر حملے کیے جا رہے ہیں، اور دکھایا جاتا ہے کہ ان کا وجود کرۂ ارض کی تہذیب و شائستگی کے حق میں ایک بار اور سد راہ ہے، اس کتاب کا مطالعہ تمام علم دوست حضرات اور خصوصاً تعلیم یافتہ مسلمانوں اور بالخصوص ان حضرات کو بے حد مفید ہوگا، جنھوں نے محض حب اسلامی اور حب قومی سے اپنی زندگی مذہب اسلام کی حمایت کے لیے وقف کر رکھی ہے، اور جن کو رات دن یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ مذہب اسلام کو نئی روشنی و تہذیب کا ساتھ دینے والا ثابت کیا جائے، اور اس پر جو ناجائز حملے کیے جا رہے ہیں، ان کی مدافعت عالمانہ طور پر کی جائے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اسلامی مشنریوں کو نہایت اعلیٰ درجہ کے ہتھیار کا کام دے گی۔ کیوں کہ علامہ مصنف نے اس کتاب میں الزامی جوابوں سے کام نہیں لیا، بلکہ ہر اعتراض کا جواب تحقیقی، اور قرآن و حدیث اور تعامل مسلمانان صدر اول اور تاریخ و فقہ اور مقننین اسلام، اور مسلمانوں کے زندہ زمانہ کی مثالوں سے دیا ہے۔ اور بالمقابل دوسرے مذاہب خصوصاً عیسائیت کے قانون اور فقہ کا ذکر کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام نے دنیا کی تہذیب و شائستگی کے حق میں کیا کیا، اور مخالفین نے کیا۔

غرض کہ مصنف نے زبردست دلائل سے ثابت کیا ہے کہ مذہب اسلام صرف سرزمین عرب اور خاص مسلمانوں کے حق میں ہی مفید نہیں ہے، بلکہ وہ یہ آیت رحمت ہے جس پر تمام دنیا کی دینی و دنیوی فلاح منحصر ہے، اور اس کا نیچر ایسا پر حکمت ہے کہ ملک و قوم اور زمانہ کا ساتھ دے سکتا ہے، اور اس طرح وہ ایک زندہ مذہب ہے، اور ریونڈ ملکم میکال کا اعتراض تاریخی شہادتوں کے بالکل خلاف ہے۔

مرحوم مصنف نے اس کتاب کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ مسائل تمدن و سیاست پر بحث کی ہے، جس میں جزیہ، دار الحرب، دار الاسلام، حقوق ذمیاں، شہادت غیر مسلمین، حقوق رعایا، ارتداد و بغاوت، مساوات اقوام غیر، عدم جواز جنگ و جدال از قرآن، مذہبی آزادی، تعمیر گرجا، معاہدوں کی پابندی، خلفاء اسلام کی تاریخی مسالمت، قانون بین الاقوام وغیرہ کا تفصیلی ذکر ہے۔

دوسرے حصہ میں مسائل معاشرت کو اسلامی روشنی میں دکھلایا گیا ہے، اور مسائل

طلاق و نکاح، تعدد زوجات، اور غلامی و تسری پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ حصہ اول کے شروع میں مصنف نے ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اس مقدمہ میں ان اہم امور پر بحث کی گئی ہے جو اسلامی فقہ کے اصل الاصول ہیں، یعنی فقہ کے دور، مذہب اربعہ کا شیوع، اختلاف زمان و مکان سے مسائل فقہی کا بدلتا رہنا، قیاس واجماع اور عدم اختتام اجتہاد وغیرہ۔

اس کتاب میں سلطنت ٹرکی کی سیاسی حالت کا ذکر بھی آیا ہے۔ علامہ مصنف نے اس سلسلۂ بیان میں ان تمام اعتراضات کی قلعی بھی کھول دی ہے جن کا سنگ بنیاد مہذب یورپ اس پر رکھتا ہے کہ اسلام کا کانسٹی ٹیوشن اس کے تنزل کا باعث ہے، اور اسی مناسبت سے مصنف نے اس کتاب کو سلطان عبدالحمید خان کے نام ڈیڈیکیٹ کیا تھا۔

محض قومی خدمت کی غرض سے اردو زبان میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ کی خوبی کے بارے میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ اس کا مترجم موجودہ زمانہ کا وہ مسلم الثبوت انشا پرداز ہے جس کے وجود سے اردو زبان زیر بار احسان ہے، جس کا نام نامی مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے (علیگ) ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ کچھ آسان نہیں تھا۔ کیونکہ گو یہ کتاب انگریزی زبان میں تھی، اور یہ بات ایک معمولی سی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کو اردو کا جامہ پہنانے کے لیے اسلامی معلومات اور عربیت کی سخت ضرورت تھی۔ کیوں کہ اس کتاب میں ہزارہا آیات قرآنی، احادیث، مسائل فقہ، اور سیکڑوں کتب علمیہ عربیہ کے اقتباسات دیے گیے ہیں، جن کا ترجمہ بغیر اصل کے مقابلہ کیے ہوئے نہیں ہو سکتا تھا، اور نہ اصلاحات عربیہ قائم رہ سکتی تھیں۔ لہذا اس کتاب کے ترجمہ میں مترجم نے جو جانکاہی و جانفشانی کی ہے وہ بجائے خود ایک مستقل تصنیف کا درجہ رکھتی ہے اور اس لحاظ سے یہ کتاب ان حضرات کو چراغ ہدایت کا کام دے گی جو اعلیٰ درجہ کی کتب علمیہ کا ترجمہ کرنا چاہتے ہوں۔

اس محنت کے علاوہ فاضل مترجم نے اصل پر بہت کچھ اضافہ کیا ہے، یعنی ایک بسیط اور جامع مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ جو تین حصوں پر مشتمل ہے:۔

حصہ اول میں علامہ مصنف کے حالات زندگی قلم بند کیے ہیں، جو بجائے خود ایک نہایت عمدہ اور مفید چیز ہے۔ اور ان سے یہ سبق ملتا ہے کہ مصنف نے محض اپنی کوشش اور مطالعہ سے یہ علمی پایہ اور مراتب دنیاوی حاصل کیے، جس کی مثال اب تک نئے تعلیم یافتہ لوگوں میں نہیں پیدا ہوئی۔ گویا مصنف کی سوانح عمری سیلف ہلپ کا ایک کامل نمونہ ہے۔

حصہ دوئم میں علامہ مصنف کی دوسری تصانیف تحقیق الجہاد ٹرو فرافٹ، کتاب زیر بحث اور دیگر کتب پر ریویو کیا گیا ہے۔

حصہ سوم میں فاضل مترجم نے ان آرا و خیالات کو جمع کیا ہے جو مشاہیر عہد اور علمائے یورپ نے کتاب ہٰذا کی نسبت ظاہر کیے تھے، مثلاً ڈاکٹر ہنٹر، ڈبلیو۔ سی بلنٹ، مصنف فیوچر آف اسلام، ڈاکٹر اسپرنگر اور سر سید مرحوم وغیرہ۔

ڈاکٹر اسپرنگر اپنے زمانہ کا مشہور عالم شرقیات گذرا ہے، اس کا خط خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ یہ خط نہایت دلچسپ اور عالمانہ ہے۔ اس میں مسلمانوں کے ترقی و تنزل کے اسباب اور ان کے علمی کارناموں پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ خط کتاب کے شایع ہونے کے بعد مصنف کو لکھا گیا تھا جس میں ان خیالات کی بے حد تعریف کی گئی ہے، جو اس کتاب میں ظاہر کیے گئے ہیں، اور مجبوراً اس کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ واقعی مذہب اسلام کے اصول کسی ترقی میں سد راہ نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ناقص تعلیم و تربیت نے مسلمانوں کو اس قعر مذلت میں ڈال رکھا ہے، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ نصاب تعلیم میں اصلاح کی جائے تاکہ انسانی ترقی کا وہ اعلیٰ مقصد حاصل ہو سکے جو مذہب اسلام کا منشا رہے۔ چنانچہ اس نے اس خط میں ایک کورس کا خاکہ بھی پیش کیا ہے، جس سے مصلحان تعلیم قدیم کو اس تعلیمی انقلاب کے زمانہ میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ قیام محمڈن یونیورسٹی علی گڈھ کا مسئلہ بہی خواہان قوم کے پیش نظر ہے۔

اگرچہ مصنف کا زمانہ کچھ بہت دور نہیں ہے، لیکن اردو خواں پبلک سے اس کا تعارف کرانا ضرور ہے، کیوں کہ مصنف اکثر و بیشتر اپنے خیالات انگریزی زبان میں ظاہر کرتے تھے۔

اس مختصر ریویو میں مصنف کی علمی اور شخصیت پر مفصل روشنی نہیں ڈالی جا سکتی. کیوں کہ وہ ایک ایسا جامع صفات شخص ہے جو اپنے تعارف کے لیے نہایت دقت نظر کا محتاج ہے. تاہم اس کتاب کا پوزیشن بتانے اور پبلک کی واقفیت کے لیے کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور ہے۔

مصنف مرحوم سرسید مرحوم کے اصحاب میں سب سے زیادہ عالم اور دقیق النظر اور اور وسیع معلومات کا شخص تھا۔ لیکن اسی قدر سب سے زیادہ خاموش تھا اور ہر وقت مطالعہ میں مصروف رہتا تھا۔ باوجود عالم شرقیات ہونے کے وہ ہمیشہ اپنے خیالات انگریزی زبان میں ظاہر کرتا تھا۔ اور اس کا روئے سخن ان علمائے اقوام غیر کی طرف رہتا تھا جن کا مقصد زندگی یہ تھا کہ مذہب اسلام کو تمام ممکن پہلوؤں سے مورد مطاعن بنایا جائے۔ لہذا مصنف مرحوم نے بھی اپنا اعلیٰ مقصد زندگی یہ قرار دیا تھا کہ مذہب اسلام کی حمایت میں اپنا دل و دماغ اور جان و مال وقف کر دے۔ جو لوگ انگریزی میں مصنف کی تصانیف تک رسائی رکھتے ہیں وہ اس کے علمی مطمح نظر اور ایثار نفس سے بخوبی واقف ہیں۔

(البلاغ)

مآثر الکرام۔ سرو آزاد

مصنفہ

حسان الہند مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی پر مولانا حکیم شمس اللہ قادری صاحب ایم۔ اے ایس۔ ایف۔ آر۔ ایچ۔ ایس۔ عالم آثار قدیمہ کا

ریویو

علم تاریخ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ سلسلہ واقعات ہے کہ جس میں مختلف قوموں اور سلطنتوں کے عروج و زوال سے بحث کی جاتی ہے، اور جس کو عرف عام میں تاریخ یا ہسٹری کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے کہ جس میں کسی ملک و قوم کے افراد کا تذکرہ کیا جاتا ہے، اس کو اسماء الرجال یا بیوگریفی کہتے ہیں۔

اسماء الرجال جس کو دوسرے الفاظ میں تذکرہ نویسی بھی کہتے ہیں کم وبیش قدیم الایام سے چلا آتا ہے۔ عبرانی، یونانی، رومی لٹریچر میں اس قبیل کی بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ لیکن ان میں زیادہ تر ملکی بہادروں کے نامی کارنامے یا اولیا و شہدا کے کشف و کرامات منضبط ہیں۔ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے اس فن کو اس قدر ترقی دی کہ جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ ان لوگوں نے تراجم، طبقات، وفیات واعیان وغیرہ کے عنوانوں میں ہزاروں کتابیں لکھ ڈالیں، اور ان میں علماء و فضلا، شعرا، حکما، امرا وغیرہ وغیرہ غرض ہر طبقہ کے لکھو کھا آدمیوں کا تذکرہ قلم بند کر دیا۔ اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ یہ تمام کارنامے ان مسلمانوں کے تھے جو بلاد ایران، روم و شام و مصر میں رہتے تھے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کے ساتھ بہت بے اعتنائی سے کام لیا۔

مسلمانان ہند کی تاریخ پانچویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانے سے لے کر

مغل ایمپائر کے انحطاط تک ہندوستان کی مردم خیز خاک سے بڑے بڑے علماء، فضلا اور نامی گرامی اہل کمال پیدا ہوئے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کے حالات مصنفین کی بے التفاتی سے اس طرح ناپید ہو گیے کہ اس وقت باوجود تلاش و تجسس کے بھی نہیں مل سکتے۔

مولانا آزاد بلگرامی بارہویں صدی میں ایک نامی گرامی مصنف گزرے ہیں۔ انھوں نے اسماء الرجال میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں، اور موقعہ پر فخر کے ساتھ اس امر کا ذکر کیا ہے کہ وہ ہندوستان میں اسماء الرجال کے سب سے پہلے مصنف ہیں۔ چنانچہ ان کی اصل عبارت یہ ہے:-

"و پیش از من احدی آستین سعی باین دریچہ نہ شکستہ و کمر خدمت بزرگان سلف و خلف باین جد و جہد نہ بستہ"

مولانا آزاد سے پہلے اگرچہ ملا عبدالقادر بدایونی اور شیخ ابوالفضل، بختاور خان عالمگیری وغیرہ مورخین نے اپنی تاریخوں میں اپنے معاصرین کا تذکرہ بھی قلم بند کیا ہے۔ لیکن یہ تحریرات اس موضوع پر مستقل تصنیف کی حیثیت نہیں رکھتی ہیں۔ مولانا آزاد اسماء الرجال کو ایک مستقل فن قرار دے کر اس کے مختلف شعبوں پر متعدد کتابیں تصنیف کیں مثلاً:-

تراجم علما میں سبحۃ المرجان، مآثر الکرام۔ تراجم شعرا میں ید بیضا۔ خزانۂ عامرہ۔ تراجم صوفیہ میں روضۃ الاولیا، شجرۂ طیبہ، وغیرہ وغیرہ۔ اس اعتبار سے اگر ہم یہ کہیں تو کچھ بے جا امر نہ ہوگا کہ مولانا آزاد بلگرامی ہندوستان میں اسماء الرجال کے سب سے پہلے مصنف ہیں۔

مآثر الکرام اسماء الرجال کی ایک قابل قدر اور بیش قیمت کتاب ہے۔ علامہ مصنف نے اس کے دو حصے قرار دیے ہیں۔ پہلے حصہ میں ان ڈیڑھ سو (۱۵۰) مشاہیر علماء و صوفیہ کا تذکرہ قلم بند کیا ہے، جو فتح اسلام سے لے کر بارہویں صدی ہجری کے خاتمہ تک سرزمین ہندوستان کے مختلف شہروں میں گذرے ہیں۔ دوسرا حصہ جس کا نام سرو آزاد ہے شعرا کے متعلق ہے۔ اس میں فارسی اور ہندی کے (۱۵۱) شعرا کا تذکرہ ہے۔ اور ہر ایک شخص کی نسبت وہ تمام باتیں درج کر دی ہیں جو اس کی سوانح عمری کے لیے ضروری اور کارآمد ہیں۔ مثلاً خاندان، قوم، وطن، تعلیم و تربیت، تلمذ۔ اخلاق و عادات، تصنیف و تالیف وغیرہ اور

ان کے ضمن میں بہت سے تاریخی واقعات و علمی نکات کا تذکرہ بھی آگیا ہے۔

مصنف نے حصہ اول کو دو فصلوں پر مرتب کیا ہے۔ پہلی فصل میں اولیائے کرام کے حالات ہیں۔ دوسری فصل میں علماء و فضلا کا تذکرہ ہے۔ ہر فصل کی ابتدا میں ایک تمہید ہے۔ پہلی تمہید میں ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے اور اسلام کے اشاعت پانے کا ذکر ہے۔ اسی طرح دوسری تمہید میں اہل اسلام میں علوم و فنون کے پھیلنے اور خلفائے بغداد و اندلس کے مشاغل علمی کا بیان ہے۔

حصہ دوم یعنی سرو آزاد کی ابتدا میں ایک مقدمہ ہے جس میں فارسی شاعری کی تاریخ بیان کی ہے۔ شعرا کے تراجم درج کیے ہیں اور اس کے ضمن میں موقع بہ موقع شعر و سخن کے قیمتی نکات کا بھی تذکرہ کر دیا ہے۔

ان دونوں حصوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اکثر مشاہیر دکن کے حالات بھی آگئے ہیں، اور نواب نظام الملک آصف جاہ اور ان کے خاندان کا تذکرہ اس شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے کہ ان کے ہم زمانہ تصنیفات سے کسی میں بھی نہیں مل سکتا۔

بارہویں صدی کے نصف آخر میں جو حوادثات پیش آئے ہیں مصنف نے ان کا ذکر نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے، اور بعض باتیں تو ایسی لکھی ہیں کہ جو کسی دوسری تاریخ میں مشکل سے مل سکتے ہیں، اور جو حضرات تاریخ دکن سے مذاق رکھتے ہیں ان کے لیے یہ حصہ (سرو آزاد) ایک لاجواب تحفہ ہے۔

فن تراجم میں یوں تو ہندوستان میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ان میں صرف دو کتابیں ایسی ہیں جو ہر زمانہ میں عزت و رفعت کی نگاہوں سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان میں ایک مآثر الامرا ہے جس میں ہندوستان کے بڑے بڑے وزرا، امرا اور عہدہ داروں کا تذکرہ منضبط ہے۔ دوسری کتاب مآثر الکرام ہے اور اس کا حصہ دوم سرو آزاد ہے، جس میں علما، فقرا اور شعرا کے حالات لکھے ہیں، اور ہر ایک کا حال اس تفصیل سے درج ہے کہ کسی دوسری کتاب میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

مآثر الامرا کو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی علم دوست جماعت نے مدت ہوئی کہ تین

ضخیم جلدوں میں چھاپ کر شایع کر دیا ہے۔ لیکن ماثر الکرام کے دونوں حصے ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔

خدا بھلا کرے مولوی عبداللہ صاحب کا کہ باوجود بے بضاعت ہونے کے اس کتاب کو نہایت اعلیٰ اہتمام سے چھپوا کر ہندوستان کی علمی تاریخ میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے، اور تمام اہل ملک کو ان کے احسان کا مشکور ہونا چاہیے۔ اور جو حضرات تاریخی مذاق رکھتے ہیں ان کے لیے یہ دونوں چراغ ہدایت کا کام دیں گے۔

پہلے حصہ کے (۳۳۴) اور دوسرے حصے کے (۴۲۲) صفحات ہیں۔ ان کی قیمت حسب ذیل رکھی گئی ہے:

ماثر الکرام	قیمت ۲ روپیہ	علاوہ محصول ڈاک
سرو آزاد	قیمت ۳ روپیہ	علاوہ محصول ڈاک

(ابلاغ)

عالم مطبوعات وصحائف

اس باب سے مقصود یہ ہے کہ اس کے نیچے وہ تمام مفید اور دلچسپ معلومات جمع کی جاسکیں جو مشرق و مغرب کی مطبوعات وصحائف سے اخذ کی جاسکتی ہیں۔ "صحائف" کے ساتھ "مطبوعات" کا لفظ اس لیے بڑھایا گیا ہے تاکہ اخبارات و رسائل کے علاوہ ہر قسم کی مطبوعہ چیزیں بھی اس کے دائرۂ نظر میں آجائیں۔ ہر ہفتہ دنیا کے مختلف حصوں میں ایک بڑی تعداد کتابوں کی شایع ہوتی رہتی ہے۔ ان کا بڑا حصہ ایسا ہے جو یا تو بآسانی میسر آجاتا ہے یا کم از کم علمی اخبارات و رسائل کے ذریعہ ان کے ضروری مطالب و فوائد معلوم ہو جاتے ہیں۔ اس عنوان کے نیچے ان کا تذکرہ کیا جاسکے گا، ضروری مطالب اخذ و نقل کیے جاسکیں گے، اور بعض حالتوں میں مختصراً نقد و تبصرہ بھی ہو جائیگا۔

اخبارات و رسائل کا یہ حال ہے کہ اگر تمام زبانوں کے اخبارات میں سے صرف انگریزی، عربی، اور ترکی زبان کے اخبارات ہی چن لیے جائیں، اور ان میں سے بھی صرف وہی لیے جائیں جو نہایت وقیع درجہ کے ہیں، جب بھی ان کی تعداد اتنی بڑی ہوگی کہ نہ تو بہ آسانی خریدی جاسکتی ہے، نہ ہر شخص اپنے اوقات فراغ میں ان سب کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ اس لیے علم و اطلاع کا بہتر و سہل ذریعہ یہی ہے کہ ان کا خلاصہ نظر سے گذر تا رہے۔ ہر اخبار میں خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ درجہ کا کیوں نہ ہو کام کی چیزیں چند ہی ہوتی ہیں اور بہ آسانی چن لی جاسکتی ہیں۔ یہی حال کتابوں کا ہے۔ یورپ کی زبانوں میں متعدد رسائل کا موضوع یہی ہے۔ اردو پریس نے ابھی تقسیم عمل کے اس درجہ تک کہاں ترقی کی ہے کہ اس قسم کے پرچے شایع ہوں؟ البتہ یہ ممکن ہے کہ چند صفحات اس کے لیے مخصوص کر دیے جائیں، الہلال میں یہ باب اسی غرض سے قرار دیا گیا ہے۔

اس باب کی اہمیت اور نفع کا اندازہ شاید فوراً نہ ہو سکے خصوصاً اس وجہ سے کہ اس نمبر میں بہت کم جگہ اس کے لیے نکل سکی۔ لیکن اگر چند ہفتوں تک اس کا مطالعہ جاری رہا تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ کس درجہ مفید اور دلچسپ چیز ہے؟ الہلال کے ان چند صفحات کا مطالعہ

کر لینا مغرب و مشرق کی مطبوعات کے تمام وقیع ذخیرہ کا مطالعہ ہو گا۔

الہلال کے ان چند کالموں کے لکھنے کے لیے جس محنت و صرف کی ضرورت ہے، مشکل ہے کہ آپ اس کا اندازہ لگا سکیں۔ جو چیز ہفتہ بھر کی لگاتار محنت و کاوش کے بعد لکھی جائے گی، وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ کے اندر آپ پڑھ لیں گے۔ ممکن ہے مطالب کی دلچسپی اتنا وقت بھی محسوس نہ ہونے دے۔ تاہم اس واقعہ سے آپ کو بے خبر نہیں رہنا چاہیے کہ سیکڑوں روپیہ کے صرف اور ایک اہل قلم کے پورے سات دن کی محنت سے یہ چند کالم تیار کیے جاتے ہیں بسا اوقات اس کی صرف ایک سطر لکھنے کے لیے ضرورت ہو گی کہ کئی کئی سو صفحوں کی کتاب یا اخبارات و رسائل اول سے لے کر آخر تک پڑھ ڈالے جائیں، اور بعض اوقات تو ایسا ہو گا کہ صفحوں کے صفحے پڑھ کر رکھ دینے پڑیں گے اور ایک سطر بھی میسر نہ آئے گی!

اس وقت دفتر الہلال میں مغرب و مشرق کے وقیع اخبارات و رسائل کا بہت بڑا ذخیرہ ہفتہ وار آتا ہے۔ انگریزی، فرانسیسی، طلیانی، جرمن، اسپینی، عربی، ترکی، فارسی اور جاپانی زبان کے روزانہ، سہ روزہ، ہفتہ وار، ماہوار، سہ ماہہ، ہر قسم کے اخبار و رسائل مہیا کیے گئے ہیں طلیانی اور اسپینی زبانوں کے سوا باقی تمام زبانوں کے مطالعہ اور اخذ و ترجمہ کا انتظام موجود ہے۔ اور امید ہے کہ بہت جلد ان دو زبانوں کے مطالعہ کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ یہی حال نئی کتابوں کا ہے۔ شاید ہی کوئی ہفتہ اس سے خالی جاتا ہو کہ نئی مطبوعات کا وافر ذخیرہ یہاں نہ پہنچتا ہو۔ ہم کوشش کریں گے کہ حتی الوسع اس تمام ذخیرہ کا بہترین خلاصہ ہر ہفتہ درج کر دیا کریں۔

یہ واضح رہے کہ "عالم مطبوعات و صحائف" کا باب "مطبوعات جدیدہ" سے مختلف ہے۔ "مطبوعات جدید" کا عنوان اس لیے رکھا گیا ہے تاکہ اہم کتابوں پر نقد و تبصرہ کیا جائے، یا اگر کسی خاص کتاب کا کوئی اہم حصہ قابل اشاعت ہو تو اسے بجنسہ نقل کر لیا جائے، لیکن عالم مطبوعات و صحائف کا دائرہ نظر عام و وسیع ہے۔ اس میں ہر طرح کی مطبوعات سے ہر طرح کی ضروری معلومات منتخب کر کے درج کی جائیں گی۔

(الہلال: ۲۴ر جون ۱۹۱۳ء)

تاریخ کبیر ذہبی

تاریخ اسلام کے عہد متاخرین میں امام شمس الدین الذہبی (المتوفی ۷۴۸ھ) کو علم و تصنیف کا جو درجہ حاصل ہے، وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ ان کا عہد آئمۂ فن کا عہد تھا تاہم جو قبولیت وشہرت ان کی مصنفات کو حاصل ہوئی، اس سے ان کے بڑے بڑے معاصر حتی کہ شیوخ واساتذہ بھی محروم ہیں۔ ان کی مصنفات میں ایک بڑا حصہ تاریخ ورجال کا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت میزان الاعتدال کے سوا (جسے سب سے پہلے ہندوستان کے ایک عالم مولانا عبدالحئ مرحوم فرنگی محلی نے چھپوا کر شایع کیا) اور کوئی معقول کتاب شایع نہ ہو سکی۔

تاریخ میں ان کی سب سے بڑی کتاب "تاریخ الاسلام وطبقات المشاہیر الاسلام" ہے جو تاریخ کبیر ذہبی کے نام سے مشہور ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے بعد اسلام کی جس قدر تاریخیں لکھی گئیں، سب کی سب اس سے ماخوذ ہیں۔ کوئی متاخر مورخ ایسا نہیں جو اس کا حوالہ نہ دیتا ہو۔ اس کے مختلف نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں لیکن تمام ناقص ہیں۔ بدقسمتی سے کسی ایک مقام پر بھی کوئی مکمل نسخہ موجود نہیں۔

یورپ کے مستشرقین اور مستشرق جماعتوں کا ایک خاص طریق کار یہ ہے کہ وہ جب کوئی خاص کتاب شایع کرنی چاہتے ہیں تو پہلے اس کے تمام موجودہ نسخوں کی ایک یادداشت تیار کر لیتے ہیں، یہ یادداشت نہایت قیمتی ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دنیا کے مختلف مقامات میں اس کے کون کون سے نسخے موجود ہیں، اور کیونکر ان سب سے اس کا ایک مکمل اور صحیح نسخہ مرتب کیا جا سکتا ہے؛ ۱۸۹۹ء میں ہالینڈ کے مشہور مستشرق پروفیسر دی گوئے De Goeie نے ایک یادداشت اس کتاب پر شایع کی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پہلی اور پانچویں جلد پیرس کے قومی کتب خانہ میں موجود ہے۔ دوسری اور چوتھی آکسفورڈ

میں ہے۔ تیسری روم اور قاہرہ میں ہے۔ چھٹی، ساتویں، اور آٹھویں برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں ہے۔ نویں سے لے کر بارہویں جلد تک قسطنطنیہ کے کتب خانہ ایا صوفیہ میں موجود ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اکثر جلدیں ناقص ہیں اور جب تک ان کے ناقص اجزار کے مقابلہ میں دوسرے نسخوں سے کامل اجزار نہ مل جائیں مکمل نسخہ کی ترتیب مشکل ہے۔ اس یادداشت میں ان اجزار کا بھی حال درج تھا، اور امید کی گئی تھی کہ مکمل نسخہ مرتب ہو جائے گا۔

ہندوستان میں بھی اس کے نسخے جا بجا پائے جاتے ہیں مگر مکمل نسخہ کہیں ہے۔ رامپور کے کتب خانہ میں تین جلدیں ہیں۔ لکھنؤ کے کتب خانۂ مولانا حامد حسین مرحوم میں بھی تین ہیں۔ بانکی پور میں ایک جلد ہے۔ مولانا ابوالکلام... کے کتب خانہ میں دو جلدیں ہیں دوسری اور چوتھی۔ غالباً حیدرآباد میں بھی بعض جلدیں پائی جاتی ہیں۔

اصل کتاب کی ایک کتابت میں بارہ جلدیں ہیں اور ایک میں تیرہ۔ مصنف نے ابتدائے اسلام سے اپنے عہد تک یعنی ساتویں صدی ہجری تک کے حالات و تراجم جمع کرنے کا التزام کیا تھا۔ ترتیب یہ اختیار کی ہے کہ پوری مدت ستر بابوں میں منقسم ہے یعنی ہر بیس برس کے لیے ایک باب ہے۔ ہر باب میں پہلے وقایع و حوادث بہ ترتیب سنین جمع کیے ہیں۔ پھر وفیات و تراجم بہ ترتیب حروف تہجی بیان کیے ہیں دوسری اور چوتھی جلد جو مولانا کے کتب خانہ میں موجود ہیں، ان میں ۱۴۱ھ سے ۱۶۰ھ تک کے، اور ۱۹۱ھ سے ۲۴۰ھ تک کے حالات ہیں۔

دنیا اس کتاب کی اشاعت سے مایوس ہو چکی تھی۔ لیکن اب شایقین علم یہ سن کر نہایت خوش ہوں گے کہ نہ صرف اس کا مکمل نسخہ مرتب کر لیا گیا ہے، بلکہ اس کی طباعت کا کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ جرمنی سے پروفیسر ہارٹ من لکھتے ہیں کہ "تاریخ کا مکمل نسخہ جو گذشتہ پندرہ سال سے زیر تصحیح و تکمیل تھا اب مکمل ہو گیا ہے۔ اور پہلی جلد کی چھپائی بھی شروع ہو گئی ہے۔"

پروفیسر موصوف کا یہ خط مولانا ابوالکلام کے نام آیا ہے جن سے ان کی خط و کتابت ۱۹۱۲ء سے جاری ہے۔ اس میں انھوں نے مولانا کے کتب خانہ کی دونوں جلدیں طلب کی ہیں، اور اس کام کی نہایت دلچسپ تاریخ بھی بیان کی ہے تاکہ الہلال میں شایع کی جائے۔ پروفیسر موصوف یورپ کے ان مشاہیر اہل علم میں سے ہیں جنھوں نے ازراہ عنایت الہلال کے لیے تحریر مقالات کا وعدہ فرمایا تھا۔ ہم آیندہ ان کی تحریر کا ترجمہ بہ سلسلۂ مقالات شایع کریں گے۔ (الہلال: ۲۴ جون ۱۹۱۴ء)

کیا یورپ میں عربی نسل موجود ہے؟

مندرجۂ صدر سوال کے جواب میں ڈاکٹر احمد شاہین ایک مصری اہل قلم نے ایک دلچسپ کتاب شایع کی ہے جو مصر کی تازہ ڈاک میں آئی ہے۔ اس میں مختلف تاریخی اور جغرافیائی مصادر سے ثابت کیا ہے کہ اس وقت تک براعظم یورپ کے مختلف مقامات میں عربی نسل کی آبادیاں موجود ہیں۔ غالباً اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو تاریخی تحقیقات کا ایک نیا میدان اہل نظر کے لیے مہیا کرتی ہے۔ مصنف نے فرانس کی عربی النسل آبادی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، ہم اس کا خلاصہ یہاں ترجمہ کرکے درج کرتے ہیں:۔

"ساتویں صدی کے اوائل میں عربوں نے فرانس پر حکمرانی کی تھی۔ کاسون کے علاقہ پران کا پورا قبضہ تھا اور ریگور، رویگ، جیود، وان ڈگلے، لورا، اور وادی رون تک ان کی فوجیں بڑھتی رہتی تھیں۔ ان کا سب سے بڑا حریف ڈیوک ڈاکٹن تھا، اور برابر مقابلے کر رہا تھا۔ لیکن جب اس کا ایک نیا دشمن پرنس چارلس مارٹل پیدا ہوگیا، تو اس نے عربوں سے صلح کرلی اور اپنی لڑکی عرب سپہ سالار عثمان بن علی سے بیاہ دی۔ اس کے بعد ۲۵۵ھ میں خود عربوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ سپہ سالار عثمان نے خلیفۂ اندلس سے الگ ہوکر خودمختاری کا اعلان کردیا۔ خلیفہ نے اس کی سرکوبی کے لیے ایک فوج گراں بھیجی۔ اہلِ یورپ نے یہ حالت دیکھی تو باہم متفق ہوکر عربوں کے مقابلے پر آگئے اور "بواتیہ" کا تاریخی معرکہ واقع ہوا۔ عربوں کو شکست ہوئی، اور وہ فرانس میں ہر طرف بھاگ نکلے۔ فرانس کے عام باشندوں نے ان کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی، بلکہ مفرورین کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ ان کی شرافت، نیکی،

اور اخلاق کی شہرت وہ مدت سے سنتے آئے تھے۔

فرانسیسیوں کا یہ حسن ظن آج تک باقی ہے۔ دیہاتوں میں اب تک عربوں کی شجاعت اور فیاضی کی داستانیں پھیلی ہوئی ہیں۔ جب کاموں سے فارغ ہو کر فرانسیسی کسان رات کے وقت بیٹھتے ہیں تو یہ پرانی کہانیاں ایک دوسرے کو سنایا کرتے ہیں۔

مقام کونٹرکسویل کے قریب ایک گاؤں "کرتبلیہ" نام موجود ہے۔ یہاں کے باشندے عام فرانسیسیوں سے بالکل علاحدہ زندگی بسر کرتے ہیں ان سے رشتہ داریاں بھی منظور نہیں کرتے۔ ان کی زبان بھی خاص ہے دوسرے لوگ اسے نہیں سمجھتے۔ کیوں کہ اس میں عربی الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ یہ لوگ شادی کی تقریب میں فرانسیسیوں کی طرح ناچ کے جلسے بھی نہیں کرتے۔ اپنی عورتوں کو باہر نکلنے سے بھی روکتے ہیں۔ ان کی اکثر عورتیں اب تک برقعہ پہنتی ہیں۔

فرانس کے علاقوں میں بکثرت ایسے دیہاتی موجود ہیں جو اپنے رنگ، ذہانت اور محنت و مشقت میں عام فرانسیسیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ لوگ بھی در اصل عربی نسل سے ہیں۔ ملک کی آب و ہوا نے ان پر زیادہ اثر نہیں ڈالا۔ صرف زبان بدل گئی ہے۔ تاہم "اللہ" کا تلفظ اس وقت تک صاف کرتے ہیں۔ اس لفظ کا استعمال ان کی زبان میں عام ہے۔ اور بھی بہت سے عربی لفظ ان کی بول چال میں موجود ہیں۔"

یہی باعث ہے کہ مشہور فرانسیسی مورخ میسو جیمو نے لکھا ہے:۔

"جب کسی کسان کو دبلا، سانولا، تیز نظر، اور جری پاؤ تو سمجھ لو کہ وہ قدیم عربوں کی نسل سے ہے۔"

ایک دوسرا مورخ تصریح کرتا ہے:۔

"میں نے بہت سے فرانسیسی کسان ایسے دیکھے ہیں جن کے نام اب تک

ہیں مثلاً فتح اللہ، عبداللہ، باب اللہ وغیرہ۔ ان کی زبان بھی عربی ہے۔ اگرچہ بگڑ گئی ہے۔ میرے سوال پر انھوں نے بتایا کہ ان کا نسب محفوظ ہے اور یہ کہ وہ عربی النسل ہیں۔"

ڈوسب اور ڈوریان بوگے کے علاقوں کے باشندے اب تک عربوں کو یاد کرتے اور ان کی بڑی تعریفیں کرتے ہیں۔ وہ تمام قدیم آثار اور شکستہ قلعوں کو عربی بتاتے ہیں۔ مغربی اور متوسط فرانس میں اب تک بہت سی عربی یادگاریں مثلاً پھاٹک اور کنویں وغیرہ موجود ہیں۔ ان کے نام بھی عربی ہیں۔ اگرچہ انھیں فرانسیسی لب ولہجہ نے مسخ کر ڈالا ہے۔

تاریخ عربی فتوحات کی برکتوں کے ذکر سے لبریز ہے۔ انھوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ ان تاریک زمانوں میں علم کا نور فرانس میں پھیلایا بلکہ ہر طرح کی تمدنی اصلاحات بھی جاری کیں۔ چنانچہ آب پاشی کے ذرائع انھیں نے مہیا کیے اور باشندوں کو ان سے فائدہ اٹھانے کے طریقے سکھائے۔ مختلف قسم کے غلے لے گئے۔ اور ان کی کاشت رائج کی۔ الپس کے پہاڑوں پر عمدہ گھاس مویشیوں کے لیے انھیں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اوبوسوں کے علاقے میں دری اور قالین بننے کے کارخانے قائم کیے۔ کورٹین نامی گاؤں میں اب تک ان کارخانوں کے عرب مزدوروں کی نسل موجود ہے۔ عربوں کے جانے سے پہلے فرانسیسی کشتی اور جہاز بنانا نہیں جانتے تھے۔ عربوں ہی سے انھوں نے یہ فن سیکھا۔ موسیو فردمنین اور گیلومیہ وغیرہ مورخین نے اپنی کتابوں میں ثابت کیا ہے کہ اہل فرانس نے فن تعمیر بھی عربوں ہی سے سیکھا تھا۔ اس کا زندہ ثبوت اب تک موجود ہے۔ فرانس کا موجودہ فن تعمیر صاف بتا رہا ہے کہ عربی ذوق اس میں کارفرما ہے۔"

(الہلال: ۲۴ر جون ۱۹۲۷ء)

قابلیت کا مقیاس و میزان

ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا میں وہی کام کامیاب ہو سکتا ہے جسے اس کا اہل اور قابل آدمی انجام دے۔ بہتر سے بہتر کام بھی کامیاب نہیں ہوگا، اگر اس کے لیے اہل آدمی میسر نہ آئیں گے۔ لیکن ہر کام کے لیے اس کی ضرورت کے مطابق اہل آدمی کیوں کر چنا جائے؟ اس کا فیصلہ آسان نہیں ہے۔

دنیا میں قدرت الٰہی کے قوانین عمل میں سے ایک قانون "انتخاب اصلح" کا ہے۔ یعنی قدرت ہر چیز میں اصلح اور بہتر کو چھانٹ لیتی ہے۔ غیر صالح اور کمتر کو چھوڑ دیتی ہے۔ زندگی، صحت طاقت، اور کامرانی کی ساری بنیاد اسی قانون پر ہے۔ افسوس انسان کی نامرادی پر، اگر وہ خود اپنی جنس کے انتخاب میں ایسا نہ کر سکے!

موجودہ زمانے میں "اہل آدمی کا انتخاب" ایک مستقل علمی موضوع ہو گیا ہے۔ اس کے بڑے بڑے ماہر فن ہیں۔ حال میں اس فن کے ایک بہت بڑے امریکن ماہر نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جو امریکہ کی ایک تجارتی انجمن کے اہتمام سے شایع ہوئی ہے۔ یہ دراصل ان مقالات کا مجموعہ ہے جو مصنف کتاب نے وقتاً فوقتاً اس موضوع پر لکھے تھے، اور امریکہ کے مختلف علمی رسائل میں شایع ہوئے تھے۔ کتاب نہایت مفید اور دلچسپ ہے، اور چوں کہ ایک خالص نظری مسئلہ کو علمی اصول و قواعد کی شکل دی گئی ہے، اس لیے علمی حلقوں نے اس کا نہایت پرجوش استقبال کیا ہے۔ ہم وقتاً فوقتاً اس کے بعض ضروری مباحث الہلال میں شایع کرتے رہیں گے۔ آج اس کے بعض ابتدائی مباحث کا ترجمہ ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔

پہلے باب میں انتخاب اہل کی ضرورت پر بحث کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:۔

(انتخاب اصلح)

"تمام کام جبھی انجام پا سکتے ہیں جب اہل آدمیوں کے سپرد کیے جائیں، ورنہ آلات کی ایجاد، بجلی کے استعمال، اور کوئلہ کی کفایت سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ یہ چیزیں کام میں مدد دیتی ہیں، لیکن کام کو کامیاب نہیں بنا سکتیں۔ کامیابی صرف اہل واصلح کارکنوں کے انتخاب پر موقوف ہے۔

ہم ہر چیز کا انتخاب کرتے ہیں۔ کوئی چیز خریدتے ہیں۔ انتخاب کرکے خریدتے ہیں۔ تم بازار میں ایک دانہ سیب لینے جاتے ہو تو ایک ایک چن کر لیتے ہو۔ یہ نہیں کہتے کہ سب سیب ہی ہیں، بغیر انتخاب کے لے لیں۔ یہی حال آدمیوں کا ہے۔ سیب کی طرح سب آدمی یکساں نہیں ہوتے۔ کچھ اچھے ہوتے ہیں، کچھ برے؛ کچھ اہل ہوتے ہیں، کچھ نااہل۔ لہٰذا ان میں بھی انتخاب ہونا چاہیے۔ اچھا اور قابل لے لینا چاہیے۔ برا اور ناکارہ چھوڑ دینا چاہیے۔ پھر محض اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ اہل و قابل کا انتخاب کر لیا جائے، بلکہ اسے اسی حیثیت میں بھی رکھنا چاہیے جس کا وہ مستحق ہے۔ مثلاً اگر ایک موسیقی داں کو موسیقی کی خدمت کے لیے منتخب کیا جائے، تو اسے دربدر پھر کر روٹی کمانے سے مستغنی کر دینا بھی ضروری ہے تاکہ بے فکر ہو کر اپنی پوری قابلیت سے فائدہ پہنچا سکے۔"

معیارِ انتخاب

اس کے بعد اس سوال پر بحث کرتے ہوئے کہ "ہر کام کے لیے اہل اور صالح شخصیت کے انتخاب کے لیے کوئی معیار اور قاعدہ بن سکتا ہے یا نہیں"؟ لکھتا ہے:-

"میرے دفتر میں چالیس آدمی کام کرتے ہیں۔ جب میں کوئی نیا کام شروع کرتا ہوں اور نئے آدمیوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، تو سب سے پہلے غور کرتا ہوں کہ یہ کام آلہ کے ذریعہ سے کیا جا سکتا ہے، حیوان کے ذریعہ، یا آدمی کی ضرورت ہے؟ اگر پہلی صورت ممکن ہوتی ہے تو وہی کام میں لاتا ہوں۔ کیوں کہ آلات حیوان و انسان سے بہتر کام کرتے ہیں۔ مثلاً پن چکی، آب پاشی، بھاری بوجھ اٹھانا

ظاہر ہے یہ کام آلات کے ذریعہ آسانی اور عمدگی سے کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر دوسری صورت ہوتی ہے تو حیوان سے کام لیتا ہوں۔ مثلاً ان مقامات میں جہاں ریل اور سڑکیں نہیں ہیں۔ باربرداری کا کام جانور زیادہ اچھا کر سکتے ہیں۔ آخری درجہ میں انسان سے کام لیتا ہوں۔ یہ اصول اگرچہ ہمارے اسلاف کو معلوم تھا مگر ان سے عملاً کام لینا صرف پچاس برس ہی سے شروع ہوا ہے۔

اب غور کرنا چاہیے، اہل و قابل اشخاص کا انتخاب کیوں کر کیا جائے؟ فرض کرو، حکومت امریکا کو ایک مرد یا عورت کی ضرورت ہے۔ امریکا کی آبادی دس کروڑ ہے۔ وہ کیا صفتیں ہیں جو مطلوبہ مرد اور عورت میں ہونی چاہئیں؟

عام طور پر پہلی شرط یہ قرار دی جاتی ہے کہ وہ شخص امریکن ہو۔ یہیں پیدا ہوا ہو، یا امریکن قومیت اختیار کر چکا ہو۔ دوسری شرط یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس کی عمر سولہ برس سے زیادہ اور ساٹھ سے کم ہو۔ اس شرط کی رو سے دو ثلث آبادی دائرۂ انتخاب سے باہر نکل جاتی ہے۔

حالاں کہ انتخاب میں ہمیں کسی ایک شرط یا صفت ہی پر اڑ جانا نہیں چاہیے۔ کیوں کہ کبھی عمر کا معاملہ قومیت سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ کبھی تربیت، قدرتی قابلیت سے زیادہ کارآمد ہوتی ہے۔ کبھی تجربہ، قابلیت سے زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ ہمیں اگر اصلح انسان کی ضرورت ہے تو اس کے لیے قومیت، وطنیت، اور عمر کی شرطیں ابتدائی شرطیں کیوں سمجھی جائیں؟

طویل غور و فکر اور تجربہ کے بعد میں نے انسانی انتخاب کا ایک پیمانہ طیار کیا ہے۔ اس میں ۲۳۔ درجے رکھے ہیں۔ انتخاب کے وقت اس پیمانہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ذیل میں اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:-

(۱) قومیت (۲) نسل

(۳) شہرت

(۴) عمر

(۵) ابتدائی تربیت یا وراثت

(۶) ذہنی قابلیت

(۷) جسمانی قابلیت

(۸) عملی قابلیت

(۹) اولین ماحول

(۱۰) تعلیم

(۱۱) عام تربیت

(۱۲) تجربہ

(۱۳) فطری قابلیت

(۱۴) فنی مہارت

(۱۵) مزاج

(۱۶) سیکھنے کی قابلیت

(۱۷) حرکات وسکنات

(۱۸) عام ذہنی یا بدنی شکل

(۱۹) قدوقامت

(۲۰) سختی یا نرمی

(۲۱) رنگ

(۲۲) کاٹھی

(۲۳) مجموعی ہیئت

جب مجھے کسی آدمی کی ضرورت ہوتی ہے تو میں یہ پیمانہ سامنے رکھ لیتا ہوں۔ اور ہر شخص کو ان تیئیس وجوہ انتخاب کی بنا پر جانچتا ہوں جس کے نمبر زیادہ نکلتے ہیں، اسے انتخاب کرلیتا ہوں۔ البتہ جانچنے والے کے لیے بھی صاحب نظر ہونا ضروری ہے۔

عام طور پر لوگ انتخاب میں فنی مہارت (اکسپرٹ نس) کو دیکھتے ہیں اور تمام صفات جو دوسرے ہوتے ہیں نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حالاں کہ یہ سخت غلطی ہے۔ جانور اور چڑیاں پالنے والے مذکورہ بالا صفات تمام کے تمام ملحوظ رکھتے ہیں۔ کیوں کہ وہ سب ضروری، اور انسان وحیوان کے مفید ومضر ہونے کا سبب ہوتی ہیں۔

ان تیئیس وجوہ انتخاب پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں کچھ تو ایسے ہیں جن کے لیے خارجی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہوگی مثلاً تعلیم، جنسیت، تربیت وغیرہ۔ اور کچھ ایسے ہیں جن کے لیے بے خطا قیافہ شناسی کی ضرورت ہوگی۔ قیافہ شناسی کی یہ استعداد بغیر اس کے حاصل نہیں ہوسکتی کہ انسانی دماغ وجسم کے علوم میں سے ہر علم سے ضروری واقفیت حاصل کرلی جائے۔

انسانی مزاج اور قابلیت کا صحیح طور پر معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ قد و قامت، رنگ و روپ، اور جسم کی کاٹھی سے بھی طبیعت کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ اس بارے میں انسان، حیوان سے بہت کچھ مختلف ہے۔ طویل تجربہ کی ضرورت ہے کہ انسان، انسان شناس نگاہ پیدا کرے۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں کسی مرد کی ذہانت یا کسی عورت کے حسن سے دھوکا کھا گیا ہوں۔

انھیں تجربوں کی بنا پر میری پختہ رائے ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق یقین ہو جائے کہ زندگی بھر کام میں لگا رہے گا، تو اس کے امتحان میں دس بیس ہزار ڈالر اور چار پانچ سال بھی بے جا نہ ہوگا۔

بلاشبہ مناسب اور اصلح آدمی کا انتخاب مشکل ہے۔ لیکن مذکورہ بالا پیمانہ اگر کام میں لایا جائے تو بڑی حد تک آسانی ہو جاتی ہے اور انتخاب میں زیادہ غلطی نہیں ہوتی۔

(ایک مثال)

کچھ مدت پہلے ریلوے میں ایک معمولی جگہ خالی ہوئی تھی۔ اس کے لیے آدمی کا انتخاب میرے سپرد کیا گیا۔ میں نے اخبارات میں حسب ذیل اعلان شایع کیا:

"ریلوے میں کام کرنے کے لیے ایک امریکن نوجوان کی ضرورت ہے۔ اسے تجربہ کار اور خوش اخلاق ہونا چاہیے۔ ساٹھ ڈالر تنخواہ دی جائے گی۔ تین مہینے امتحان کیا جائیگا۔ پھر اضافۂ و ترقی کا سوال پیدا ہوگا۔ درخواست کرنے والوں کو اپنی تین تصویریں بھیجنی چاہئیں: ایک اپنے رخسار اور کنپٹی کی۔ دوسرے پورے چہرہ کی۔ تیسری پورے قد کی۔"

تین سو درخواستیں آئیں اور چھ گھنٹے معاینہ میں صرف ہوئے۔ ۲۹۰ میں نے پہلی ہی نظر میں مسترد کر دیں۔ کیوں کہ ان کی شکلوں میں کوئی نہ کوئی نمایاں عیب موجود تھا۔ بعضوں کے لباس اور خط و خال سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ محض ناکارہ ہیں۔ بعضوں کی ہیئت اور قطع بتلا رہی تھی کہ بڑے ضدی ہیں سیکھنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ بعضوں کے دل و دماغ

اور اخلاق کی کمزوری عیاں تھی۔

باقی دس تصویروں کی میں نے پوری دیدہ ریزی سے جانچ کی دو آدمی مطلوب تھے۔ مگر جانچ میں چار پورے اترے اور تجربہ نے بتادیا کہ میری جانچ درست تھی۔ خود آدمیوں سے ملاقات کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ان کی تصویریں منگالی جائیں اور ان کا وقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔"

(چار تصویریں)

اس کے بعد مصنف نے نو آدمیوں کی تصویریں درج کی ہیں اور ہر تصویر کے نیچے صاحب تصویر کے اوصاف بھی درج کر دیے ہیں۔

(۱) دماغی آدمی ــــــــ یہ شکل ایک ایسے آدمی کی ہے جو سنجیدہ، مطمئن، حلیم ہے۔ کم منفعل ہوتا ہے۔ زیادہ غور کرتا ہے۔ سوچ سمجھ کر رائے قائم کرتا ہے اور اس سے کبھی ہٹتا نہیں۔ حال سے زیادہ ماضی پر نظر رکھتا ہے سست عمل ہے۔ مگر ہوشیاری سے کام کرتا ہے، ہمیشہ ایک ہی طریقہ پر رہتا ہے۔

(۲) دماغی عملی آدمی ــــــــ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا ہے۔ بلند ہمت ہے۔ محنتی ہے۔ مضبوط ارادہ رکھتا ہے۔ شک کو پاس آنے نہیں دیتا ہے۔ فصیح اللسان ہے۔ اپنی قوت اور اپنے کام کی اہمیت پر یقین رکھتا ہے۔ صاف دماغ کا مالک ہے۔

(۳) عملی دماغی آدمی ــــــــ خوش کلام۔ دلوں کا محبوب۔ سب کو راضی رکھنے والا، بلند ہمت، فراخ دل، ترقی اور محنت کا شیدائی، بہت حرکت کرنے والا، بہت نفع پہنچانے والا، تنہائی میں کام کرنے والا، مستقل مزاج۔

(۴) عمل کی قوت نفوذ رکھنے والا آدمی ــــــــ مضبوط ارادہ، مضبوط رائے، سخت مزاج، سنگ دل، جلد منفعل ہو جانے والا، تنہائی پسند، بھروسہ اور اعتماد کے لائق۔ اس کی مثال اس ہیرے کی سی ہے جو خراد سے ہنوز محروم ہے۔

(۵) مستعد عملی آدمی ـــــ سخت اور درشت مزاج، عزم صادق کا مالک، کم غور کرنے والا، اپنے نفس پر بھروسہ رکھنے والا، کتنی ہی مشکلات ہوں مگر اپنے ارادہ پر عمل کرنے والا۔

(۶) دماغی عملی آدمی ـــــ خوش گفتار، بڑی بڑی اسکیمیں سوچنے والا، دوسروں پر اثر ڈالنے والا، اپنے اصلی خیالات چھپانے والا، اپنی رائے پر جمار ہنے والا، گرد و پیش پر نظر رکھنے والا، اپنے اوپر بہت بھروسہ رکھنے والا، صاف دماغ کا مالک۔

(۷) دماغی عملی آدمی ـــــ مستقل رائے رکھتا ہے، زیادہ نفع پہنچاتا ہے۔ معاملات پر صحیح رائے رکھتا ہے۔ خوش تقریر ہے۔ صاف بیان ہے۔ فراخ دل ہے۔ ترقی اور رفاہ عام کے کام زیادہ پسند کرتا ہے۔

(۸) دماغی آدمی ـــــ نرم مزاج، محجوب، حلیم، مضبوط رائے رکھنے والا، سست عمل، متفکر، متاثر نہیں ہوتا، حق کو سنتا ہے اور قبول کرلیتا ہے۔

(۹) دماغی عملی آدمی ـــــ صاف رائے رکھتا ہے، بحث میں قوی دلیلیں لاتا ہے، مخلص ہے، حق کا جویا ہے، زندہ ضمیر کا مالک، معتمد ہے، مخاطب کو اپنی گفتگو سے قائل کر دیتا ہے۔

ان نو قسموں میں اصولی قسمیں در اصل چار ہیں: دماغی، عملی، دماغی عملی، عملی دماغی، اور انھیں کے متعدد نمونے دکھائے گئے ہیں۔ دماغی اور عملی کا مطلب واضح ہے۔ "دماغی عملی" سے مقصود ایسی شخصیت ہے جس کے خصائل میں اگرچہ عملیت کا عنصر بھی موجود ہے لیکن غلبہ دماغیت کو ہے۔ "عملی دماغی" اس کے برعکس ہے۔ اس میں عملیت غالب اور دماغیت مغلوب ہوتی ہے۔ خالص "دماغی" "عملی قوت سے، اور خالص "عملی" دماغی اوصاف سے عاری ہوتا ہے...

(الہلال: یکم جولائی ۱۹۲۷ء)

مطبوعات جدیدہ:

ایک صدی قبل ایک مغربی خاتون کی مشرقیت

(لیڈی اسٹن ہوپ)

حال میں ایک فرانسیسی اہل قلم موسیو بلوشر نے ایک نئے قسم کے تاریخی موضوع پر کتاب لکھی ہے: "اٹھارہویں صدی میں مغرب و مشرق کا اتصال" اس میں ان تمام یورپین اشخاص کے حالات جمع کیے ہیں جنھوں نے اٹھارہویں صدی میں "مشرقیت" اختیار کرلی تھی۔ "مشرقیت" سے مصنف کا مقصود یہ ہے کہ مشرقی ممالک کی رسوم، معاشرت، وضع و قطع، اور ذوق و فکر کا اس طرح اختیار کرلینا، گویا مغربیت ترک کرکے سرتاسر مشرقیت اپنے اوپر طاری کرلی ہے!

مصنف کو اس موضوع میں اس سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی ہے، جتنی کامیابی کی بظاہر توقع کی جاسکتی ہے۔ ایک بہت بڑی تعداد یورپ کی تمام اقوام کی نظر آتی ہے جس نے ترکی، مصر، شام، عراق، ہندوستان، اور چین میں توطن اختیار کرلیا تھا، یا بہت زیادہ مدت تک کے لیے مقیم ہوگئی تھی، اور اپنا مغربی جامہ اتار کر سرتاسر مشرقی جامہ پہن لیا تھا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کے ہندوستانی انگریزوں، ہندوستانی فرانسیسیوں اور ہندوستانی ڈچوں کے حالات سے تو ہم بے خبر نہیں ہیں، لیکن دوسرے مشرقی ممالک کے ان مشرقی مغربیوں کے حالات یقیناً ہمارے لیے نئی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

اب زمانے کی رفتار الٹ چکی ہے۔ اب مغربیوں کی مشرقیت کا نہیں بلکہ مشرق کی "مغربیت" کا دور دورہ ہے۔ یقیناً ایک ایسے عہد میں یہ حالات ہمارے لیے عبرت انگیز دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

آج ہم اس کتاب سے ایک انگریز خاتون کے حالات مع تصاویر کے نقل کرتے ہیں۔ یہ خاتون مشہور انگریز مدبر سر ولیم پٹ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اسے شام ولبنان کی مشرقیت، نے کچھ اس طرح لبھا لیا تھا کہ اپنا وطن، اپنی قوم، اور مغربی دنیا کے تمام علائق ترک کر کے ہمیشہ کے لیے لبنان میں مقیم ہو گئی اور بالآخر وہیں پیوند خاک ہوئی۔

(لیڈی اسٹن ہوپ)

۱۷۷۶ء میں ایک انگریز لڑکی پیدا ہوئی۔ باپ کی طرف سے اس کا رشتہ لارڈ اسٹن ہوپ سے، اور ماں کی طرف سے لارڈ چیتھم سے ملتا تھا۔

لارڈ اسٹن ہوپ "باغی لارڈ" کے لقب سے مشہور تھا کیوں کہ وہ انقلاب فرانس کا بہت بڑا مداح اور جمہوریت کا حد غلو تک حامی تھا۔

لارڈ چیتھم، مشہور برطانوی وزیر اعظم ولیم پٹ کا باپ تھا۔ نپولین اعظم کے نام کے ساتھ پٹ کا نام بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔ دونوں کی دشمنی، دشمنی کی حد سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔ ولیم پٹ نے جب جان دی، تو اس کے آخری الفاظ یہ تھے: "جنگ، جنگ" یعنی فرانس سے جنگ۔

یہ لڑکی بچپن ہی سے عجیب الاطوار تھی۔ انتہا پسندی اسے اپنے دادھیال سے ورثہ میں ملی تھی۔ مستقل مزاجی اور خیال کی آزادی ننھیال سے پائی تھی۔

جب وہ چار برس کی تھی، اس کی ماں مر گئی۔ باپ نے نئی شادی کر لی۔ لڑکی اپنے باپ کی بیوی سے نباہ نہ کر سکی اور اپنی نانی کے گھر چلی گئی۔ نانی کی موت کے بعد اپنے ماموں ولیم پٹ کے ہاں اٹھ آئی۔ یہاں اسے انگلستان کے مشہور ترین آدمیوں اور یورپ کے بڑے بڑے مدبرون کے دیکھنے کا موقعہ ملا، اور یورپین سیاست کے بہت سے راز اس پر کھل گئے۔

۱۸۰۶ء میں ولیم پٹ کا بھی انتقال ہو گیا۔ مگر مرنے سے پہلے بھانجی کے نام پندرہ سو پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر کر گیا۔ اب اس نے متوفی ماموں کا گھر بھی چھوڑ دیا اور دیہات میں اٹھ گئی۔ کئی سال دیہاتی زندگی میں بسر کر دیے۔

اپنے ماموں کے گھر اور دیہات میں انگلستان کے بہت سے معزز نوجوانوں سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ بعض کی محبت نے اس کے دل کا التفات حاصل بھی کیا، مگر نامعلوم اسباب کی بنا پر وہ شادی نہ کر سکی، یا شادی کرنی نہ چاہی۔

یہ بات نہ تھی کہ وہ بدصورت ہو اور مرد اس سے نفرت کرتے ہوں۔ اس کا شمار حسینوں میں تھا۔ سرو قامت اور چھریرا بدن رکھتی تھی۔ لیکن اس کے خط و خال زنانہ ہونے کی جگہ زیادہ تر مردانہ تھے۔ اس لیے نسوانی کشش اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے تھے۔

(مشرق کی سیاحت)

سنہ ۱۸۱۰ء میں اس کا بھائی بھی مرگیا۔ اس سے وہ بڑی محبت کرتی تھی اور اپنی زندگی اس کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ یہ حادثہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ غم غلط کرنے کے لیے سمندر کے سفر کا قصد کیا۔ پہلے صرف جبل طارق تک جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن جب وہاں تک پہونچ گئی تو آگے بڑھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ یہاں تک کہ مشرق کے تمام مشہور مقامات یونان، ترکی، مالٹا، مصر وغیرہ کی اس نے سیر و سیاحت کر لی۔ اس وقت یہ تمام ممالک عثمانی سلطنت کے زیر نگیں تھے۔

(مشرقیت کی ابتدا)

ایک مرتبہ اس سیاحت کے اثنا میں ایسا اتفاق ہوا کہ اس کی کشتی سمندر میں ٹوٹ گئی۔ قریب تھا کہ سب ڈوب جاتے۔ لیکن عین وقت پر بچا لیے گئے۔ چوں کہ اس حادثہ میں اس خاتون کے کپڑے ضایع ہو گئے تھے، اس لیے ایک ترک افسر نے اپنی جنگی وردی اتار کر دے دی اور اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اپنا مغربی اور جنسی لباس ترک کر کے اس نے مشرقی اور مردانہ کپڑے پہنے۔ لیکن یہ وضع کچھ ایسی دل کو بھا گئی کہ مدت العمر کے لیے مردانہ مشرقی وضع اختیار کر لی!

لڑکی ایک ترک افسر کی وردی پہنے اسکندریہ میں داخل ہوئی اپنی سہیلی کو بھی مردانہ

لباس اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ چند روز آرام کر کے فلسطین روانہ ہوئی۔ یہاں ترکی وردی اتار کر مصری ممالک کا پر شوکت لباس اختیار کر لیا۔ سر پر عمامہ، جسم پر قفطان اور جبہ، سنہری تلوار کمر میں، اس انگریز خاتون کی جو سر ولیم پٹ وزیر اعظم برطانیہ کی بھانجی تھی، دل پسند وضع تھی!

ملکہ زینوبیا (زبا) کی اس ویران راجدھانی کے کھنڈروں میں (کیوں کہ وہ فلسطین ہی میں تھی) اسے غیر معمولی کیفیت محسوس ہوئی۔ یہاں اس مرد نما خاتون کو صحرا نشینوں نے ملکۂ صحرا کا تاج پہنایا!

(مشرقیت کا فیصلہ)

معلوم ہوتا ہے، اسی زمانہ میں اس کے اندر مشرقی توطن اور مشرقی زندگی کا خیال پیدا ہو گیا تھا، اور اس نے اپنی بقیہ زندگی کے لیے ایک آخری فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ حماۃ اور انطاکیہ ہوتی ہوئی دیر الیاس نامی مقام پر پہنچی، اور یہاں آبادی سے باہر پہاڑ پر اپنے لیے ایک قلعہ تیار کرایا۔ یہی قلعہ اس کا گھر اور یہی پہاڑ اس کا وطن ہو گیا۔ یورپ اور یورپ والوں کو بالکل بھول گئی، عربی حقہ منھ سے لگا کر دھواں اڑاتی، گھوڑے پالتی، غلام خریدتی، اور ایک مشرق نژاد امیر کی سی زندگی بسر کرتی۔ اس کے پاس چالیس غلام تھے۔ خود اسی نے انھیں جنگی قواعد بھی سکھائی تھی۔

آہستہ آہستہ اس نے بڑی قوت اور اہمیت حاصل کر لی۔ اب اس کی حیثیت ایک طاقت ور شیخ قبیلہ کی سی ہو گئی تھی۔ بستی کے تمام قبائل اس کے مطیع ہو گئے تھے۔ یہ پوری فیاضی کے ساتھ انھیں روپیہ دیتی، اور انھیں کی زبان میں ان سے باتیں کرتی۔ ان کے تمام جھگڑے قضیے اسی کے سامنے آتے۔ یہ تمام مقدمات کا ایک حکمراں کی طرح فیصلہ کرتی اور مجرموں کو سزائیں دیتی۔ قرب و جوار کے سرکش لوگوں سے مقابلہ بھی جاری رہتا۔ اس کی دھاک تمام علاقہ میں بیٹھ گئی تھی۔ لوگ اس کے رعب سے کانپتے تھے۔ اس کے پاس ایک جلاد بھی نوکر تھا جو عادی مجرموں کو قتل کرتا تھا۔ قید خانہ بھی بنایا تھا۔ مجرموں کو اس میں قید کرتی تھی۔

۲۵ برس یہاں رہی، اور اس طرح رہی، کہ اس علاقہ کی ایک طاقت ور امیر سمجھی جاتی تھی۔ بسا اوقات دول یورپ بھی مجبور ہوئیں کہ اس کی خوشامدیں کریں۔ انگریز ہونے پر بھی وہ انگریزوں اور انگریزی حکومت سے سخت نفرت کرتی تھی۔ اس جوار میں جب کبھی انگریز ریشہ دوانیوں کرتے، یہ فوراً اس کا توڑ کر دیتی۔ اس وقت انگلستان کی خارجی نظارت یقین کرتی تھی کہ یہ عجیب و غریب انگریز عورت مشرق میں اس کی ایک خطرناک دشمن ہے!

اس کی ہمت، شجاعت، قوت، کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ لبنان کے مشہور دروزی سردار "امیر شہاب" جیسے جبار سے بھی اس نے مقابلہ کیا تھا!

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ محمد علی خدیو اول کے بیٹے ابراہیم پاشا نے جب شام پر حملہ کیا، تو اس سے درخواست کی کہ یہ غیر جانب دار رہے۔ یہ ابراہیم پاشا وہی تھا جس نے ایک طرف حجاز میں نجدیوں کا تخت الٹ دیا تھا، دوسری طرف سلطنت عثمانیہ کو اپنے جبروت کے آگے جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اسے گھوڑوں کا بڑا شوق تھا۔ اصیل سے اصیل عربی گھوڑے اس کے اصطبل میں بندھے رہتے تھے۔ بلیوں سے بھی بہت محبت تھی۔ اس کا قلعہ بلیوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہ جادو، نجوم، اور تناسخ کی بھی قائل تھی۔

(لامارٹین سے ملاقات)

۱۸۳۲ء میں مشہور فرانسیسی شاعر و مصنف لامارٹین[1] اس سے ملا تھا۔ جب اس نے

---

[1] لامارٹین انیسویں صدی کا مشہور فرانسیسی شاعر اور مصنف ہے جس کی نسبت تسلیم کیا گیا ہے کہ شعر موسیقی (لیرک) کے جدید مذہب (اسکول) کا بانی وہی ہے۔ مشرق اور مشرقی شاعری سے بھی اسے غیر معمولی دلچسپی تھی خیال کیا جاتا ہے، اس کے کلام کا وہ حصہ جس میں خدا کی حمد و ثنا ایک نئے اسلوب میں کی گئی ہے اور اس کی صفات و تجلیات کے مظاہر کا استغراق نمایاں ہوتا ہے، در اصل اسلامی الٰہیات و تصوف کے مطالعہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مشرق قریب کا سفر کیا تھا۔ اس وقت وہ بوڑھی ہو چکی تھی۔ شاعر نے اس کی بابت اپنا تاثر جن لفظوں میں ظاہر کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں :۔

"اس کی شخصیت، ذاتی عظمت اور انوکھے اطوار سے مرکب ہے۔ اس مرکب کی تحلیل کرنے کی ناکام کوشش کی جگہ ہمیں اس کا نام جنون رکھ دینا چاہئے۔"

یہ شاعر کی رائے ہے۔ لیکن خود خاتون نے شاعر کو کس نظر سے دیکھا؟ وہ اپنی یادداشت میں لکھتی ہے :۔

"یہ شخص تصنع کا عادی ہے۔ زنانہ اطوار رکھتا ہے۔ ہمیشہ اپنے پیروں کی سبکی اور نزاکت دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ مذہب کے بارے میں جب اس سے سوال کیا جاتا ہے تو صاف جواب دینے سے ڈرتا ہے۔"

وہ اپنے ملاقاتیوں کے ساتھ ایوان میں مردوں کی طرح بیٹھا کرتی تھی۔ گفتگو کا انداز یہ تھا گویا مقرر تقریر کر رہا ہے۔ رات رات بھر باتیں کرتی رہتی۔ یہاں تک کہ ملاقاتی بے اختیار ہو کر سو جاتے تھے۔

(بڑھاپا اور خاتمہ)

اس کی زندگی کے آخری دن بڑی ہی تکلیف میں کٹے۔ بڑھاپے میں زمانہ میں سود خوار یہودیوں کا افسوں اس پر چل گیا تھا۔ قرض کی عادت پڑ گئی تھی۔ اسراف کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دیوالیہ ہو گئی۔ صرف چار غلام باقی رہ گئے تھے۔ باقی تمام خدم و حشم

(پچھلے صفحہ کا باقی حاشیہ) کا پرتو ہے۔ سنہ ۱۸۳۲ء میں اس نے اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ اس وقت سلطان عبدالمجید خاں مرحوم تخت عثمانی پر متمکن تھے۔ انھوں نے جب اس سیاح کے حالات سنے تو ملاقات کے لیے بلایا، اور اسمرنا اور لبنان میں ایک بہت بڑا قطعۂ زمین بطور جاگیر کے بخش دیا۔ اس کے بعد سے لامارٹین کچھ عرصہ اسمرنا میں رہتا۔ کچھ عرصہ لبنان میں۔ اسی زمانہ میں اس نے اپنا مشہور سفرنامۂ مشرق مرتب کیا اور دولت عثمانیہ کی تاریخ آٹھ جلدوں میں لکھی۔ مندرجۂ متن رائے اس کے سفرنامہ سے ماخوذ ہو گی، اگرچہ مصنف نے حوالہ نہیں دیا ہے۔

(الہلال)

رخصت کرنا پڑے اور تمام جائداد ہاتھ سے نکل گئی۔ حتیٰ کہ ولیم پٹ کا وظیفہ بھی قرضہ کی نذر ہو گیا۔ سن ۱۸۳۶ء میں اس خوددار خاتون نے ملکہ وکٹوریا اور وزیراعظم انگلستان کو اپنی حالت زار سے آگاہ کیا اور اعانت کے لیے بڑی بڑی منتیں کیں مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ صحرا کی ملکہ فاقے کرنے لگی۔ عمر کی زیادتی، بڑھاپے کی کمزوری، پرانی عظمت کی یاد، موجودہ بے سروسامانی، غرضیکہ سیکڑوں مصیبتیں بہ یک وقت ٹوٹ پڑی تھیں۔ بالآخر بیمار ہوئی اور ۱۸۳۹ء میں اپنے پیچھے ایک عجیب تاریخ چھوڑ کر فوت ہو گئی۔ بیروت کے انگریز قونصل نے سنا تو فوراً پہنچا، اور تجہیز و تکفین کے رسوم انجام دے کر محل کے باغ میں نعش دفن کر دی۔

مدت کی غفلت کے بعد ۱۹۱۱ء میں انگلستان کو یہ خاتون یاد آئی اور اس کی قبر پختہ بنوا دی گئی۔ مصنف کا بیان ہے کہ ۱۹۱۳ء میں اس نے قلعہ کے کھنڈر اور اس کی نئی بنی ہوئی قبر دیر الیاس میں دیکھی تھی۔

(الہلال: ۱۵ جولائی ۱۹۲۷ء)

علم الآثار مصر

مصر کی قدیم تہذیب دنیائے قدیم کی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب ہے۔ اگر یہ باب الگ کر دیا جائے تو نوع انسانی کی عقلی ترقیات کی ایک نہایت اہم کڑی مفقود ہو جائے گی۔

اب سے سو برس پہلے مصر کے اہرام اور حیرت انگیز آثار دنیا کے لیے معما تھے۔ آج وہ معما نہیں ہیں، مدرسہ کا کام دے رہے ہیں۔ قدیم مصری خط "ہیروگلیفی" پڑھ لیا گیا ہے۔ قدیم مصری زبان کے ضخیم لغت طیار ہو گئے ہیں۔ قدیم مصری تحریریں دستیاب ہو گئی ہیں۔ اور ان سب کے مجموعے سے علوم اثریہ کا ایک مرتب ذخیرہ مدون ہو گیا ہے جسے مصریات (اجپٹیالوجیا) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور روز بروز اس کی وسعت بڑھتی جاتی ہے۔ حال میں ڈاکٹر احمد بک کمال مرحوم کی بے نظیر کتاب آثار مصر پر شایع ہوئی ہے۔ یہ قاہرہ کے دارالآثار کے ناظر تھے۔ انھوں نے تمام عمر اثریات مصر کی تحقیقات میں بسر کر دی۔ یہ کتاب اس موضوع پر علمی دنیا کی آخرین تحقیقات پیش کرتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں وقتاً فوقتاً اس کے بعض اہم مباحث الہلال میں شایع کرتے رہیں۔

(بقاء روح کا مصری اعتقاد)

"قدیم مصری تمدن کے سب سے زیادہ عجیب آثار جو ہم تک پہنچے ہیں، ان کے مقبرے اور ان کی ممی کی ہوئی نعشیں ہیں۔ اہرام بھی در اصل اسی غرض سے بنائے گئے تھے کہ مقبرہ کا کام دیں۔ اس سے ان کے مذہبی عقائد پر جو موت، بعد الموت، اور روح کے خلود و ابدیت سے تعلق رکھتے تھے، غیر معمولی روشنی پڑتی ہے۔"

مقبروں کی تاسیس

قدیم مصر میں مقبروں کا آغاز اس طرح ہوا کہ پہلے مردے کو زمین کھود کر تنگ گڑھے میں گاڑ دیتے تھے۔ نعش لٹانے کا بھی رواج نہ تھا۔ سر سینہ پر جھکا دیا جاتا تھا اور اکڑوں بٹھا کر زمین برابر کر دیتے تھے۔ اس کے بعد قبر یاد رکھنے کے لیے زمین اونچی کرنے لگے۔ قبر پر مٹی کا ڈھیر لگا دیا جاتا تھا۔ پھر مردے کو اوپر کی مٹی سے بچانے کے لیے قبر کے اندر چھت بنانے لگے۔ پھر چھت کے گرد مٹی کی دیواریں بنا دینے کا رواج پڑا۔ اسکے بعد تابوت کا خیال پیدا ہوا۔ اور پتھر کے تابوتوں میں مردے رکھے جانے لگے۔ پھر قبر کو بیرونی صدموں سے بچانے کے لیے اس پر عمارتیں بنانے لگے۔ انھیں عمارتوں نے ترقی کرتے کرتے اہرام کا عظیم و مہیب درجہ حاصل کر لیا۔ اس وقت بھی دریائے نیل کے مصب اور فیوم کے مابین تقریباً سو حرم موجود ہیں، اگرچہ ان میں سے اکثر منہدم ہو جانے کے قریب ہیں۔

اب یہ بات محقق ہو گئی ہے کہ مصر کے اہرام درحقیقت مقبرے ہی تھے۔ قدیم مورخین کا یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ یہ قلعے ہیں، یا طوفان سے بچنے کے لیے بنائے گئے تھے یا ان میں خزانے مدفون ہیں۔ قدیم مصری زبان میں اہرام کے نام ہی سے ان کا مقصد اور موضوع معلوم ہو جاتا ہے۔ مثلاً "مسکن ابدی" "مقام کمال" "مکان خلود" "مقر روح" وغیرہ۔

مقبروں کے باب میں یہ تدریجی ترقی کیوں ہوئی؟ اس لیے کہ روح کی ابدیت کا اعتقاد بھی مصریوں میں بہ تدریج ترقی پذیر ہوا تھا۔ جس زمانہ میں وہ روح کی بقا کے قائل نہ تھے، قبروں کے معاملہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ پھر جوں جوں یہ عقیدہ بڑھتا گیا، مقبروں کی اہمیت بھی بڑھتی گئی۔ مقبروں کو اس عقیدہ سے کیا تعلق ہے؟ بہت قریبی تعلق ہے۔ مصریوں کا یہ عقیدہ اس شکل میں تھا کہ جب تک جسم محفوظ رہتا ہے، روح بھی قائم رہتی ہے۔ کیوں کہ جسم سے علٰحدہ روح کا وجود نہیں ہو سکتا۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ مردے کا جسم زیادہ سے زیادہ مدت تک محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اتنے مستحکم مقبرے بنانا، اور لاشوں کو ممی کرنا، اسی غرض سے تھا۔

(زندگی کا مصری تخیل)

یہ عقیدہ کیوں کر موجود ہوا؟ مصریوں کا خیال تھا کہ زندگی ایک آدمی سے دوسرے آدمی میں ناک اور منھ کی راہ منتقل ہوتی ہے۔ اور یہ کہ انسانی جسم کے بعض اعضاء زندگی کی حفاظت کرتے ہیں، مگر صرف اسی حالت میں جب کہ خود ان کی بھی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ ہاتھ کی نبض زندگی کی محافظ ہے، اس لیے ہاتھ میں چوڑی پہن کر نبض کی حفاظت کی جاتی تھی۔ گردن کو بھی ایسا ہی عضو سمجھتے تھے اور اس کی حفاظت کے لیے ہار پہنتے تھے۔ کان کے لیے بالیاں، سینہ کے لیے چاندی سونے کی لوحیں، بازو کے لیے بازو بند، اسی لیے ان میں رائج ہو گئے۔ بہت ممکن ہے کہ دنیا میں زیور کا استعمال اسی عقیدہ سے شروع ہوا ہو۔

(موت)

ان کا اعتقاد تھا کہ زندگی ہمیشہ رہتی ہے۔ لیکن نیند کی حالت میں اور کبھی کبھی غشی کی حالت میں آدمی سے جدا ہو جاتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ جب جسم بگڑ جاتا ہے تو زندگی کا علاقہ بھی اس سے ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی خیال سے نعش کی حفاظت کا خیال ہوا۔ اور بالآخر ممی کرنے کا طریقہ رائج ہو گیا۔ یہ طریقہ اتنا عجیب، اتنا صحیح اور اتنا بے خطا تھا، کہ چار چار ہزار برس گزر جانے پر بھی آج اصلی حالت میں ان کی نعشیں موجود ہیں!"

(الہلال: ۲۲ جولائی ۱۹۲۷ء)

پان یورپین تحریک اور امن عالم

اس وقت جب کہ جنیوا میں اسلحہ کی تخفیف و تحدید کے مسئلہ پر بحثیں ہو رہی ہیں، ایک نئی کتاب کے مضامین یقیناً دلچسپی کے ساتھ پڑھے جائیں گے جو حال میں شایع ہوئی ہے، اور "پان یورپین تحریک" یعنی وحدت اقوام یورپ کی تحریک کے ایک جرمن داعی کاونٹ رچرڈ کوڈنہو کیلرگی (Richard Gaudenhove Kalegri) کے قلم سے نکلی ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے پہلے امن عالم کی ضرورت پر بہت موثر پیرایہ میں نظر ڈالی ہے۔ پھر ثابت کیا ہے کہ اس کا تنہا ذریعہ یہی ہے کہ "یورپین طاقتوں کی روز افزوں ہتھیار بندی موقوف کر دی جائے"، لیکن "ہتھیار بندی" سے مقصود کیا ہے؟ صرف لوہے اور آگ کے ہتھیار؟ مصنف اس سے انکار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے "صرف لوہے کے ہتھیاروں سے نہتا کر دینا کچھ مفید نہ ہوگا۔ یورپ کو اس کے سیاسی، اخلاقی، اور اقتصادی حربوں سے بھی نہتا کر دینا چاہیے۔ اس کے بغیر ہتھیار بندی کی مخالف تحریک بے فائدہ ہے۔ جب تک بغض و حسد کے چھالے قوموں کے دلوں میں موجود رہیں گے، اس وقت تک دنیا میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔"

اس کے بعد مصنف لکھتا ہے :-

"یورپ کی سلامتی کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں؛ مختلف قوموں کے مابین عدل قائم ہو جائے، اور جنگ اور جنگ کے اسباب روکنے کے لیے سلطنتیں اپنی قوت استعمال کرنے پر متفق ہو جائیں۔"

آگے چل کر مصنف نے مختلف مغربی طاقتوں کی موجودہ جنگ جویانہ حالت پر نظر ڈالی ہے:

"وارسلیز کے معاہدہ نے جرمنی کو نہتا کر دینے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ لیکن یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ جرمنی کو اس کے مسلح پڑوسیوں کے درمیان نہتا کر کے چھوڑ دیا جائے؛ یورپ کے امن وامان کے بنیادی شرط یہ ہے کہ تمام سلطنتیں ایک ساتھ اور ایک ہی قسم کا قدم اٹھائیں۔ یا تو سب مسلح ہو جائیں، یا سب ہتھیار رکھ دیں۔ بعض کا ہتھیار بند رہنا اور بعض کا ہتھیار رکھ دینا، امن کا نہیں جنگ کا موجب ہے۔"

"یورپین سواحل کی سلامتی کی سب سے زیادہ آسان اور عملی صورت یہ ہے کہ برطانیہ اپنے جنگی بیڑے کے ذریعہ حفاظت کی ذمہ داری لے لے۔ نہ یہ کہ ہر سلطنت اپنی بحری قوت بڑھا کر جنگ کا ایک اور خطرہ پیدا کر دے۔ اگر برطانیہ اس پر راضی ہو جائے کہ اپنا جنگی بیڑا یورپ کی ضرورتوں کے لیے وقف کر دیگی تو بلاشک دنیا کا امن وامان یقینی ہو جائے گا۔ لیکن برطانیہ یہ اسی وقت منظور کر سکتی ہے جب تمام دول یورپ طے کر لیں کہ اپنی مجموعی بحری قوت، برطانیہ کی بحری قوت سے کم کر دیں گی۔"

"ترکی کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد روس ہی ایک ایسی سلطنت ہے جس کی سرحدیں خشکی میں یورپ سے ملتی ہیں۔ روسی سرحدیں بہت وسیع ہیں اور بے شمار مشکلات کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ روس کا اپنے تمام پڑوسیوں سے جھگڑا ہے۔ سب سے زیادہ اہم اس کے سیاسی اور اجتماعی جھگڑے ہیں۔ پھر روس کی آبادی بھی بہت بڑی ہے۔ جنگی طیاریاں بھی عظیم ہیں۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اس کی اصلی غرض تمام دنیا میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔ روسی مدبر حیرت انگیز مستعدی سے انقلاب کی تخم ریزی کر رہے ہیں۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ روس اپنے مقاصد کی اشاعت امن وآشتی سے کرنی چاہتا ہے، وہ سخت فریب خوردہ ہے۔ روس جنگ کو اپنے مقاصد کی کامیابی کا ایک ہی ذریعہ سمجھتا ہے۔"

"روس سے مفاہمت کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ یورپ اس کی سرحدوں کا احترام کرے اور وہ یورپ کی سرحدوں کا۔"

"یورپ کو کسی حال میں بھی روس پر حملہ کا ارادہ نہیں کرنا چاہیے۔ نہ اس کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت کرنی چاہیے۔"

"یورپ کی داخلی سلامتی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کے موجودہ سیاسی نظام میں کامل تبدیلی نہ ہو جائے۔ یورپ کی حفاظت کے لیے کوئی نہ کوئی نظام ضرور مرتب ہونا چاہیے۔"

"یورپ سے اچانک ہتھیار رکھا لینا ناممکن ہے۔ اس معاملہ میں پیش قدمی ان سلطنتوں کو کرنی چاہیے جو اس کی زیادہ ضرورت محسوس کرتی ہیں۔ جب یہ سلطنتیں باہم ایک رائے پر متفق ہو جائیں گی۔ تو دوسری سلطنتیں بھی ان کی پیروی پر مجبور ہو جائیں گی۔ جنگی قوت کے اعتبار سے یورپ کی نو سلطنتیں زیادہ اہم ہیں۔ اگر یہ آپس میں متحد الخیال ہو جائیں تو تمام دول یورپ کو سر جھکا دینا پڑے گا جن کی تعداد اس وقت ۲۵ ہے۔ مجلس اقوام یا دول عظمیٰ میں سے کسی ایک کو اس مقصد کے لیے کانفرنس بلانی چاہیے۔ کانفرنس میں حسب ذیل امور طے کرنے چاہئیں۔"

(۱) تمام دول یورپ پختہ عہد کرلیں کہ ان میں سے کوئی کسی پر اعلان جنگ نہ کرے گی۔

(۲) ہر باہمی نزاع مابین الاقوامی پنچایت کے سامنے فیصلہ کے لیے پیش کیا جائیگا۔

(۳) غیر یورپین حملوں کے مقابلہ میں تمام یورپ متحد ہو جائے گا۔

(۴) اگر اس معاہدہ پر دستخط کرنے والی ایک سلطنت، دوسری پر حملہ کرے گی تو تمام دول مل کر اسے سزا دیں گی۔

(۵) غیر یورپین سلطنتوں سے دول یورپ نے جتنے معاہدے کر رکھے ہیں، سب منسوخ کر دیے جائیں۔"

(الہلال: ۲۹ جولائی ۱۹۲۷ء)

استحضار و مخاطبات ارواح

قارئین الہلال اس سے بے خبر نہ ہوں گے کہ انیسویں صدی کے وسط میں استحضار و مخاطبات ارواح (روحوں کے آنے اور مختلف محسوس ذرایع سے سوال وجواب کرنے) کا جو مذہب امریکہ میں ظاہر ہوا تھا، وہ برابر نشو و نما پاتا رہا، اور اس وقت یورپ اور امریکہ میں اس کے معتقدوں کی ایک بہت بڑی جماعت موجود ہے۔ اس جماعت میں ہر درجہ اور ہر طبقہ کے آدمی پائے جاتے ہیں۔ فلسفۂ و حکمت کے ماہر، علوم و فنون کے اساتذہ، علمی و صناعی انکشافات و اختراعات کے مشاہیر، ادب و کتابت کے مسلم ارکان، عام اہل قلم و نظر، کوئی حلقہ ایسا نہیں ہے جہاں تک اس اعتقاد کے اثرات نہ پہونچ چکے ہوں۔ اس کے اصول و قواعد مدون ہو چکے ہیں، بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں، تحقیقات و تجارب کے باقاعدہ مجامع کام کر رہے ہیں، پچاس سے زیادہ اخبارات و رسائل صرف اسی موضوع پر شایع ہو رہے ہیں، ایک مکمل مذہب علمی کی شکل میں قواعد و مبادیات مرتب ہو گئے ہیں، اور معاملہ نے اس حد تک اہمیت حاصل کرلی ہے کہ وقت کے بعض اکابر اہل علم نے اپنے درس و نظر کے لیے صرف یہی موضوع منتخب کر لیا ہے!

انیسویں صدی کے اواخر کے علمار میں سے پروفیسر رسل ویلز نے جو ناموس نشو و ارتقا کے اکتشاف میں ڈارون کا معاصر و شریک تھا، صاف صاف لفظوں میں اس کا اعتراف کیا تھا، اور اسے عصر حاضر کے خوارق سے تعبیر کیا تھا۔ پروفیسر ولیم کروکس نے جو انگلستان کا سب سے بڑا عالم کیمیا تسلیم کیا گیا ہے، اور جس نے سب سے پہلے مادہ کے اشعاع کی حقیقت معلوم کی اور برق کے لیے وہ نیا آلہ ایجاد کیا جو اسی کے نام سے مشہور ہے، کئی

ماہ کی تحقیقات و امتحان کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ "مخاطبات ارواح کے مشاہدات ناقابل انکار ہیں۔" ڈاکٹر میرس (MUEF°) اور رچرڈ ہاڈسن کیمبرج یونیورسٹی میں علم النفس کے مسلم اساتذہ تھے۔ ان دونوں نے بھی بغیر کسی جھجھک کے اپنے اعتراف کا اعلان کر دیا تھا۔ پروفیسر لومبروزو (LOMBROSO) جو اٹلی کا مشہور ماہر طبیعیات ہے اور جس نے باسٹیور کے بعد جراثیم کے علم کی تدوین کی، نہ صرف اس کا معترف ہوا بلکہ اس موضوع پر ایک رسالہ بھی لکھ کر شایع کیا۔ کیمیل فلامادیاں (Camille Flammarian) انیسویں صدی کے علمائے فلکیات میں نہایت سربرآوردہ عالم تھا۔ غالباً چار یا پانچ سال پہلے اس کا انتقال ہوا ہے۔ یہ نہ صرف اس کا معترف تھا بلکہ نہایت پرجوش معتقد تھا۔ اس کی آخری دو کتابیں اسی موضوع پر ہیں اور یورپ کی تمام زبانوں میں شایع ہو چکی ہیں۔ پروفیسر مکسلی، ڈاکٹر لوئس، سرجان کاکس، پروفیسر بارکس، پروفیسر زولنر، ڈاکٹر ویبر، ولیم لیوپولڈ وغیرہم جو انیسویں صدی کے دائرۂ علم و نظر کے مسلم ارکان تھے، کم و بیش اس کا اعتراف کر چکے ہیں۔

امریکہ کے مشاہیر علم و نظر میں چارلس نارٹن اور ولیم ڈاسن جو شکاگو یونیورسٹی (امریکہ) میں علم النفس (سائیکولوجی) کے استاد تھے، اس کی تصدیق و حمایت میں برابر مقالات و رسائل شایع کرتے رہے۔ انگلستان کے عام مشاہیر سیاست و ادب میں مسٹر بالفور اور مسٹر اسٹیڈ (سابق محرر ریویو آف ریویوز) کا نام بھی اس کے معتقدین کی فہرست میں مشہور ہو چکا ہے۔ مسٹر اسٹیڈ نے تو روحانی سوال و جواب کا ایک باقاعدہ دفتر کھول دیا تھا۔ ان کے عالم ارواح کے دوستوں میں سب سے زیادہ مشہور دوست اسکاٹ لینڈ کی "مارگریٹ" تھی۔ ان کا بیان تھا کہ وہ "مارگریٹ" کے ذریعہ عالم ارواح کی تمام ضروری شخصیتوں سے نامہ و پیام کر لیا کرتے ہیں!

موجودہ عہد کے مشاہیر اہل علم میں چارلس الیٹ، ولیم جیمس، جیمس ہیزلوب، اور سر آلیور لاج (Oliver Lodge) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ چارلس الیٹ اور ولیم جیمس ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) میں علم النفس کے استاد ہیں، جیمس ہیزلوب کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) میں علوم عقلیہ کے مستند ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں، اور سر آلیور لاج کی علمی

شہرت محتاج بیان نہیں۔ یہ تمام علماء اس مذہب پر علمی تیقن کے ساتھ اعتقاد رکھتے ہیں اور اس کی اشاعت و تبلیغ ان کی تحریر و تقریر کا موضوع بحث ہے۔ سر آلیور لاج کا لڑکا پچھلی عالم گیر جنگ میں قتل ہو گیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ مرنے کے بعد ہی اس کی روح نے انھیں مخاطب کیا، اور اب بھی وہ جب چاہیں، اسے بلا سکتے ہیں اور اس سے سوال و جواب کر سکتے ہیں!

(سر کونن ڈائل)

لیکن موجودہ زمانے کے مغربی روحانیین میں شاید ہی کسی اہل قلم نے اس تبلیغی جوش و سرگرمی کے ساتھ اس مذہب کا اعتقاد ظاہر کیا ہوگا، جیسا کہ کچھ عرصہ سے انگلستان کے مشہور فسانہ نویس سر کونن ڈائل (Conan Doyle) کی شخصیت میں ظاہر ہوا ہے۔ عالمگیر جنگ یورپ کے بعد سے لے کر اس وقت تک، بمشکل کوئی مہینہ ایسا گزرا ہے، جس میں سر ڈائل کی کوئی نہ کوئی تحریر و تقریر اس موضوع پر شایع نہ ہوئی ہو۔ حال میں انگلستان کی انجمن روحانیین نے ایک نہایت دلچسپ مجموعہ بارہ مقالات کا شایع کیا ہے۔ ان میں سے آٹھ مقالات سر ڈائل کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب پچھلی ڈاک سے ہمیں وصول ہوئی ہے اور اس موضوع پر افکار و تاثرات کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔

موجودہ انگریزی علم ادب میں سر کونن ڈائل کا نام ان کے مخصوص مذہب افسانہ نویسی کی وجہ سے اسقدر مشہور ہو چکا ہے کہ شاید ہی کوئی افسانہ نویس اس قدر مشہور ہوا ہو۔ انھوں نے فن سراغ رسانی کی افسانہ نویسی میں ایک نئے مذہب (اسکول) کی بنیاد ڈالی اور "شرلاک ہومز" کے نام سے اس کے حیرت انگیز کارنامے قلمبند کیے۔ ان کے قلم سے اگرچہ مختلف معاشرتی اور نفسیاتی مواضع پر بہت سے افسانے نکل چکے ہیں، لیکن ان کی شہرت کی اصلی تاریخ شرلاک ہومز کے کارناموں ہی سے شروع ہوئی۔ ان افسانوں کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ شرلاک ہومز کا جو فرضی مکان نمبر ۱۰۔ بیکر اسٹریٹ لنڈن میں دکھایا گیا تھا، وہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دماغ میں ایک حقیقی شے کی طرح موثر ہو چکا ہے، اور جب کبھی سیاحان عالم پہلی مرتبہ

لنڈن جاتے ہیں تو یہ جاننے پر بھی کہ "شرلاک ہومز" محض ایک فرضی سراغ رساں سیرت (کیریکٹر) ہے، اپنی طبیعت کو اس جذبہ سے نہیں روک سکتے کہ ایک مرتبہ بیکر اسٹریٹ جاکر کسی ایسے مکان کی زیارت کرلیں جس کا نمبر دس ہو۔

احمد ریاض نے "عبدالحمید ثانی و دور سلطنتی" (یعنی سلطان عبدالحمید ثانی اور اس کے عہد حکومت کی تاریخ) میں لکھا ہے کہ سلطان موصوف شرلاک ہومز کے کارناموں کے اس قدر شائق تھے کہ حکم تھا، جوں ہی کوئی نیا افسانہ شایع ہو، فوراً ترکی میں ترجمہ کرکے پیش کردیا جائے۔ ایک خاص شخص ادیب بے اس کام پر مامور تھا۔ آخری زار روس کی نسبت بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ کہتا تھا "مجھے کتابوں کی قسم میں سے کوئی چیز بھی دل پسند نہیں ہے الا شرلاک ہومز"

یہی شرلاک ہومز کا مصنف اب دنیا میں عالم ارواح کا سب سے زیادہ پرجوش و سرگرم نقیب اور داعی ہے۔

(سر کونن ڈائل کے مقالات)

جس نئی کتاب کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے، اس کے آٹھ مقالات دراصل سر کونن ڈائل کے روحانی اعتقاد کی پیدائش و تکمیل کی مسلسل داستان ہیں۔ پہلے مقالہ میں اس نے تبلایا ہے کہ کس طرح پہلے پہل اسے مذہب مخاطبات ارواح کی طرف توجہ ہوئی، اور کس طرح ایک جاحد منکر کی جگہ وہ مصدق معتقد بن گیا۔ دوسرے میں اپنے متعدد تجربے اور مشاہدے بیان کیے ہیں۔ تیسرے اور چوتھے میں منکرین کے وجوہِ انکار پر بحث کی ہے۔ پانچویں سے لے کر آٹھویں مقالہ تک کا موضوع عالم مادی و روحی کے علائق ہیں اور اس ضمن میں ان امکانات کی نہایت دلنشین تصویر کھینچی ہے جو بیان کردہ علائق کی ترقی سے دنیا کی معنوی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کردیں گے۔

(سر کونن ڈائل کا بیان)

پہلے مقالہ کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"۱۸۸۶ء سے پہلے میں جنوبی افریقہ میں طبابت کرتا تھا۔ اس وقت میرے عقائد کا یہ حال تھا کہ ان لوگوں پر ہنستا تھا جو روح کے مستقل وجود پر یقین رکھتے ہیں۔ میں خیال کرتا تھا کہ اس سے زیادہ بے عقلی اور وہم پرستی کی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

میں بھی آج کل کے تمام جدید تربیت یافتوں کی طرح سائنس پر ایمان رکھتا تھا۔ میرا مذہب، مذہب مادی تھا۔ میرا اعتقاد تھا کہ روح، بجز اس کے کچھ نہیں کہ جسم کے وظائف و ترکیب ہی کا ایک نتیجہ ہے، اور عقل کا مرکز دماغ میں ہے۔ میرا یقین تھا کہ دوائیں انسانی طبیعت میں تبدیلی پیدا کر سکتی ہیں۔ اور اسے نیک اور بد بنا دے سکتی ہیں۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ موٹی سی بات نہیں آئی کہ ایک ماہر موسیقی ہمیشہ ماہر موسیقی ہی رہے گا اگرچہ اس کی بانسری ٹوٹ جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ اپنا ہنر ظاہر نہ کر سکے گا، لیکن اس کا کمال اس میں بدستور موجود رہے گا۔

سب سے پہلے جس کتاب نے میرے خیالات میں تبدیلی پیدا کی اور مجھے الحاد و مادیت سے نکالا، وہ "میرز" کی کتاب "شخصیت انسانی" ہے۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ ان کتابوں میں سے شمار کی جائے جنھوں نے انسانی افکار کا بہاؤ ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دیا ہے۔ مثلاً ڈارون کی کتاب اصلیت انواع اور بیکن کی کتاب منطق جدید۔

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد میں نے انتقال فکری کے تجربے شروع کیے۔ میرے ایک دوست مسٹر بال کو بھی اس موضوع سے بڑی دلچسپی تھی میں ان کے پیچھے بیٹھ جاتا اور کاغذ پر بعض نقشے بناتا۔ مجھے ہر مرتبہ یہ دیکھ کر حیرت ہو جاتی تھی کہ وہ میرے بنائے ہوئے نقشے بعینہٖ اپنے کاغذ پر اتار لیتے تھے، حالاں کہ وہ میرا کاغذ نہیں دیکھتے تھے۔ پھر میں نے یہ تجربہ بھی کیا

کہ وہ دوسرے مکان میں بیٹھا کریں۔ لیکن پھر بھی میں نے دیکھا کہ وہ نقشوں کی بالکل صحیح نقل اتار لیتے تھے۔

اس وقت مجھے یقین ہوا کہ عقل کو دماغ کا ویسا فعل سمجھنا صحیح نہیں ہو سکتا جس طرح ہم صفرہ کو جگر کا فعل سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے تھیا سوفی کا مطالعہ شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ اس تحریک کی علم بردار اور رہنما میڈم بلیوٹسکی ذہین مگر مکار عورت ہے۔ لیکن اس دروغ گو عورت کی موجودگی سے اس تحریک پر حرف نہیں آسکتا۔ یہ ایک صحیح تحریک ہے۔ یہ ضرور ترقی کرے گی۔ مگر اسی وقت، جب اس کے ارکان وہ چولا اتار دیں گے جو اس عورت نے اسے پہنا رکھا ہے، اور تحریک کے حقیقی سرچشموں تک پہنچیں گے جو مشرق کی سرزمین پر موجود ہیں۔

پھر میں نے وہ تمام کتابیں پڑھیں جو علمائے عقلیات نے مذہب کے خلاف لکھی ہیں۔ لیکن مجھے کوئی تشفی نہیں ہوئی۔ کیوں کہ وہ کبھی ایجابی بات کہتے ہی نہیں۔ ان کے پاس جو کچھ ہے، سلبی و انکاری ہے۔

مدت تک دنیا کی دوسری مشغولیتوں اور مسلسل سفر میں رہنے کے بعد پھر مجھے اس اہم موضوع کے لیے مہلت ملی۔ بتدریج مجھ میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ ہماری اس زندگی کے علاوہ کوئی اور مخفی زندگی بھی ضرور موجود ہے اور وہ شاید ہماری زندگی سے زیادہ لطیف اور خوش گوار ہے۔

۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء میں انجمن علوم نفسیہ نے مجھے اور ڈاکٹر اسکاٹ اور مسٹر بوڈمر کو ایک مکان کی تحقیقات کے لیے بھیجا۔ اس مکان کے متعلق مشہور تھا کہ اس میں روحیں رہتی ہیں۔ اور شور و ہنگامہ بپا کیا کرتی ہیں۔

ہم دو رات اس مکان میں رہے۔ پہلی رات کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ دوسری رات ڈاکٹر اسکاٹ مایوس ہو کر چلے گئے۔ صرف میں اور مسٹر بوڈمر رہ گئے۔ ہم نے ہر طرح کے دھوکے سے بچنے کا پورا انتظام کر لیا تھا۔ زینہ پر تار بچھا دیے

تھے تاکہ ادنیٰ سی حرکت کا بھی ہمیں علم ہو جائے۔

ٹھیک آدھی رات کو ہم نے اچانک سخت شور سنا۔ ایسا معلوم ہوا، گویا کوئی میز کو موٹی لاٹھی سے پیٹ رہا ہے۔ ہم نے فوراً دروازہ کھولا اور باورچی خانہ کی طرف دوڑ پڑے جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ مگر ہمیں سخت حیرت ہوئی۔ باورچی خانے کا دروازہ اور کھڑکیاں بالکل بند تھیں۔ زینہ پر کھچے ہوئے تار بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے۔

اس کے بعد رات بھر ہم نے کوئی آواز نہیں سنی۔

اس واقعہ کے چند سال بعد یہ مکان جل گیا۔ اس کا باغ کھودا گیا تو زمین سے دس برس کے ایک لڑکے کی ہڈیاں نکلیں۔ یہ رات کا شور در حقیقت اسی لڑکے کی روح کا شور تھا۔ وہ اسی گھر میں قتل ہوا تھا اور اس کی روح اس میں رہنے والوں کو پریشان کیا کرتی تھی۔

اس سلسلہ میں یہ نظریہ بہت سے لوگوں کے سامنے ہے کہ اگر کسی جوان آدمی کی زندگی کسی غیر طبیعی اچانک حادثہ سے تلف ہو جائے، تو اس کی روح کی حیویت موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے اور عجیب عجیب صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔"

کانن ڈائل نے آخر میں لکھا ہے:۔

"اس قسم کے بے شمار واقعات مشاہدہ کرنے کے بعد میں نے اس علم کا وسیع مطالعہ کیا۔ یہاں تک کہ اب مجھے اس پر پورا یقین ہو گیا ہے۔ میرا اعتقاد ہے کہ روحوں سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔"

اس کے بعد کے مقالات میں وہ تجربے اور مشاہدے بہ تفصیل بیان کیے ہیں جو سالہا سال تک وہ "اپنے اذعان و تشفی کے لیے" جمع کرتا رہا۔ پھر ان اعتراضات اور شکوک کے جوابات دیے ہیں جو ان کے خیال میں منکرین مذہب استحضار کے "بنیادی" اعتراضات ہیں۔

(الہلال: ۱۹ راگست ۱۹۲۷ء)

غدر ۱۸۵۷ء
اور
تصویر کا دُوسرا رُخ

(قسط اول)

حال میں ایک کتاب امریکہ سے شایع ہوئی ہے جس کا نام The other side of medal ہے۔ یعنی "تصویر کا دوسرا رخ" اس کا مصنف ایک مشہور اہل قلم ایڈورڈ ٹامسن ہے۔ اس نے یہ کتاب اس لیے لکھی ہے کہ "غدر ۵۷ء کے اثنا میں برطانی حکام نے جو انتقامی تدابیر اختیار کی تھیں، یا حکومت کے رعب وہیبت کے مظاہرہ کے لیے جو خونریزیاں جائز رکھی گئی تھیں، ان کے واقعات مستند تاریخی مصادر سے اخذ کر کے یکجا کر دیے جائیں، اور اس ہندوستانی غدر کی ہولناک تصویر کا دوسرا رخ بھی دنیا کے سامنے آجائے۔"

غدر ۵۷ء کی تصویر کا ایک رُخ تو وہ تھا جو باغی فوج کے قتل وغارت اور لوٹ مار کی صورت میں دنیا دیکھ چکی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ وحشیانہ طرز عمل دہلی، لکھنؤ، اور کانپور میں بے گناہ انگریز عورتوں اور بچوں کا قتل تھا۔ قلعہ دہلی میں ۵۲ انگریز مقید تھے۔ باوجود بدقسمت بہادر شاہ مرحوم کی پیہم مخالفانہ کوششوں کے، باغی فوج نے انہیں قتل کر ڈالا۔ غالباً ۷ سے لے کر ۱۱ تک (کیونکہ روایات مختلف ہیں) ان میں عورتیں بھی تھیں۔ لکھنؤ میں بھی غدر کے بعد، ۲۵ انگریز قیدی تلنگوں کے ہاتھوں قتل ہوئے جن میں ایک تہائی تعداد عورتوں کی تھی۔ کانپور میں جاں بخشی کا عہد کرنے کے بعد جو حملہ انگریزوں کی کشتیوں پر کیا گیا جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے، وہ نانا راؤ کے حکم سے ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن یقیناً حد درجہ کا وحشیانہ فعل تھا۔

مختلف مقامات میں غیر مسلح اور بے پناہ انگریزوں پر ان کے فوجی نوکروں نے جو حملے کیے اور عورتیں تک قتل کر ڈالی گئیں، بلاشبہ اخلاق و انسانیت ان کے لیے کوئی معذرت قبول نہیں

کرے گی۔

یہ ۵۷ء کی تصویر کا ایک رخ ہے، اور ایک سو سے زیادہ انگریز اہل قلم اس کی وحشت و ہولناکی کے خال وخط نمایاں کر چکے ہیں۔

لیکن تصویر کے دوسرے رخ کی شہادت کیا ہے؛ وہ اخلاق و انسانیت کا مرقع ہے، یا وحشت و ہولناکی کا؟ پہلے رخ سے کم ہولناک ہے یا زیادہ؟ دنیا کی ان حکمران اور قابو یافتہ قوموں میں جنھیں انتقام و غضب کے موقعہ پر اپنی اخلاقی سیرت (کریکٹر) کے مظاہرہ کا موقعہ ملا ہے، انگریزی قوم کس جگہ کی مستحق ہے؟ اس نے خود ہندوستانیوں کی مدد سے فتحیاب ہو کر ہندوستان کے سب سے بڑے شہروں میں جو قتل عام کیا، اور جس طرح غیر مسلح، غیر محارب، اور یک قلم بے گناہ آبادی تہ و بالا کر دی گئی، تاریخ کو اس کے لیے کیا فیصلہ کرنا چاہیے! یہ سوالات ہیں جو غدر ۵۷ء کی تاریخ سے قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ اس وقت تک مورخانہ نظر و تحقیق کی روشنی اس گوشہ پر نہیں پڑ سکی۔

اس نئی کتاب میں مسٹر ٹامسن نے سوالات پر روشنی ڈالی ہے، اور کوشش کی ہے کہ مستند اور بے لاگ تاریخی مصادر سے واقعات جمع کر دیے جائیں مصنف کے لیے مشکل تھا کہ وہ اپنے مقصد میں پوری کامیابی حاصل کرتا۔ اس کے پاس حکومت ہند کے سرکاری افسروں اور انگلستان کے بعض نیم سرکاری مباحث کے سوا اور کوئی ذریعۂ علم نہ تھا، اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں ذرایع اس بارے میں غیر طرف دار نہیں قرار دیے جا سکتے۔ تاہم تاریخی شہادات کا جس قدر ذخیرہ بھی جمع ہو گیا ہے، اس سے بحیثیت مجموعی "تصویر کا دوسرا رخ" نمایاں ہو جاتا ہے۔

اب ہندوستان اس منزل سے گزر چکا ہے جب اس قسم کے واقعات محض سیاسی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی اصلی حیثیت سیاسی نہیں بلکہ تاریخی ہے۔ ۵۷ء جیسا عظیم واقعہ جس نے ہندوستان کے نئے دور حیات کے ہر گوشہ پر اثر ڈالا، ضروری ہے کہ تاریخ کے سامنے پیش کیا جائے، اور اسے چھوڑ دیا جائے کہ اپنا فیصلہ ثبت کر دے۔

ذیل میں ہم اس کتاب کے بعض ضروری حصوں کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔ یہ ترجمہ مولوی محمد علی صاحب وکیل ایبٹ آباد نے کیا ہے ان کا ارادہ ہے کہ پوری کتاب کا ترجمہ اردو میں مرتب کر دیں۔

امید ہے یہ ترجمہ پوری دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

آکسفورڈ میں یہ مثل عام طور پر مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص ہندوستان کے متعلق کسی معمولی درجہ کے ایوان میں بھی لیکچر دے، تو تمام سامعین یک لخت ایوان خالی کر دیں گے۔ ایک زمانہ تھا جب انگریز علماء ہندوستانی علوم و فنون میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ ہندوستانی مسائل پر کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ اس تبدیلی کا سبب یہ ہے کہ ہمیں یقین ہو گیا ہے، ہندوستانی ہماری حکومت سے تنگ آ گئے ہیں۔ انھوں نے ہمارے حسن انتظام کی قدر نہیں کی۔ ہم اگر اب بھی قربانی کر سکیں تو ہندوستان کو بزور شمشیر قابو میں رکھ سکتے ہیں۔

لیکن جو شور و غل جلیانوالہ باغ کے قتل عام پر ہوا تھا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد سے کہیں زیادہ رحم دل واقع ہوئے ہیں کیوں کہ ہم ہندوستان میں دوسرا غدر پیدا کرنا نہیں چاہتے۔

اب ہمارے لائق اور ہونہار نوجوان ہندوستانی ملازمتوں سے گریز کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معمولی قابلیت کے آدمی ہندوستان جا رہے ہیں۔

ہندوستان کے متعلق غلط اور بے بنیاد پروپیگنڈا یورپ میں پھیلایا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے باشندے محض وحشی اور صحرائی ہیں۔

ہندوستانی مورخ نہیں ہیں۔ انہیں واقعات کو سلسلہ وار ترتیب دینا نہیں آتا۔ وہ تحقیق کے نئے طریقوں سے ناآشنا ہیں یہی وجہ ہے کہ آج تک غدر ۱۸۵۷ء کے متعلق ہندوستان میں کوئی تاریخ صحیح شایع نہیں ہوئی۔ حالانکہ دوسری طرف انگریزوں نے اس واقعہ پر سیکڑوں کتابیں لکھ کر مشتہر کیں۔ یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا ہے۔

غدر کے اسباب

عام طور پر غدر کے دو سبب بیان کیے جاتے ہیں۔ اولاً یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے تمام صوبے یکے بعد دیگرے اپنی حکومت میں ملا لیے تھے۔ اس واسطے ہندوستانیوں کے دلوں

میں کمپنی کے متعلق بہت سے شکوک پیدا ہو گیے۔ دوسرا سبب وہی چربی والے کارتوسوں کا قصہ ہے۔

اینسن (ANSEN) جو ان دنوں کمانڈر انچیف تھا لکھتا ہے:۔

"میں نے مشکوک کارتوس دیکھے ہیں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ سپاہیوں کے عذرات حق بجانب ہیں۔ مجھے یہ ہرگز خیال نہ تھا کہ ان کارتوسوں کے استعمال میں گائے اور سوٴر کی چربی لگائی جائے گی۔ میرے خیال میں ہندوستانی سپاہیوں کے جذبات کی مطلق پرواہ نہیں کی گئی۔"

یہ کارتوس جو انھیں دنوں میں رائج کیے گئے تھے، سوٴر اور گائے کی چربی سے آلودہ ہوتے تھے اور بیشتر اس کے کہ انھیں بندوقوں میں ڈالا جائے، دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا اس کارتوس کے چند حصے ایسے سخت ہوتے تھے کہ دانت کے استعمال کے چلائے نہیں جا سکتے تھے۔ ہندو مذہب میں گائے کا احترام کیا جاتا ہے، جب انھیں یہ کارتوس استعمال کرنا پڑے تو سخت رنج ہوا یہی حال مسلمان سپاہیوں کا بھی تھا۔ چنانچہ تمام فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ رسالہ نمبر ۳ مقیم میرٹھ کے ۸۵ سپاہیوں نے ایسے کارتوسوں کے استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کورٹ مارشل کیا گیا۔ اور دس دس سال کی سزا دی گئی۔ جس طریقے سے یہ حکم سنا گیا تھا وہ تہذیب سے گرا ہوا تھا۔ مصنف موصوف نے اس خوف ناک منظر کا نقشہ یوں کھینچا ہے:۔

"۸۵ سپاہیوں کو گارد کی حراست میں فوجی عدالت کے روبرو پیش کیا گیا اور یہ سخت حکم سنایا گیا۔ ان کی فوجی وردی ان کے جسم سے اتار دی گئی پھر اسی وقت بیڑیاں پہنائی گئیں۔ یہ نہایت دردناک نظارہ تھا۔ ان کے ساتھیوں کو ان کی حالت زار پر ترس آ رہا تھا۔ ان قیدیوں میں بہت سے ایسے سپاہی بھی تھے جنھوں نے انگریزوں کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں کی تھیں اور مختلف لڑائیوں میں عدیم المثال بہادری دکھائی تھی۔ تمام قیدیوں نے باآواز بلند جرنیل کی منت وسماجت کی کہ اس بے عزتی سے بچایا جاوے۔ لیکن کسی نے پرواہ نہ کی جب وہ مایوس ہو گئے تو انھوں نے اپنے ساتھیوں کو للکار کر کہا تمھیں شرم نہیں

آتی کہ ہم اس مصیبت میں گرفتار ہیں اور تم خاموشی سے تماشہ دیکھ رہے ہو؟
اس دردناک اپیل سے حاضرین کے دل پر گہرا اثر پڑا۔ ممکن تھا کہ وہ کچھ کرگذرتے لیکن توپوں اور بندوقوں کی موجودگی میں وہ کیا کر سکتے تھے؟ ناچار انھیں صبر کرنا پڑا۔ لیکن اس واقعہ سے ہر ایک ہندوستانی انگریزوں کے خلاف ہوگیا۔ وہ لوگ جو ان کی خاطر اپنی جانیں لڑاتے تھے، یکلخت ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔"

لارڈ کیننگ گورنر جنرل نے اس واقعہ کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "یہ ایک ایسا احمقانہ حکم تھا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ بغاوت کا آغاز اسی حکم سے شروع ہوتا ہے۔"

دوسرے دن (یعنی ۱۰ ؍مئی ۱۸۵۷ء) ایک رسالہ اور دو پیادہ فوجوں نے جیل خانے کے اندر دروازے زبردستی کھول کر اپنے ساتھیوں کو آزاد کر دیا۔ پھر انگریز افسروں کے گھر جلا دیے جہاں کہیں کوئی فرنگی ملا قتل کر دیا گیا، اور اس کے بعد سب کے سب دہلی روانہ ہوگئے۔ جب باغی پلٹنیں دہلی پہنچیں۔ تو وہاں بھی انھوں نے انگریزوں کے قتل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ جب ایک محکوم قوم اپنے حاکموں سے جنگ و جدل پر آمادہ ہو جاتی ہے تو دونوں طرف سے وحشیانہ حرکات ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے سے ظالمانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے، حتیٰ کہ طاقت ور جماعت محض اپنے زور سے دوسری جماعت کو کچل دیتی ہے۔ فرینک ٹرنٹ نے تاریخ انگلستان میں لکھا ہے۔

"یہ لڑائی دو وحشی قوموں میں ہو رہی تھی۔ انھوں نے رحم و انصاف بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اگر انھیں کوئی خیال تھا تو صرف یہ تھا کہ کسی طرح ان کے دشمن تباہ ہو جائیں۔ دونوں طرف سے سخت مظالم کیے گئے جن پر پردہ ڈالنا ہی مناسب ہے۔"

انگریزی تواریخ نے اپنی حرکات پر تو واقعی پردہ ڈال دیا ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کے مظالم کا بہت بری طرح سے خاکہ کھینچا گیا۔ سیکڑوں فرضی قصے تواریخ میں درج کیے گئے تاکہ

انگریزوں کو ان کے پڑھنے سے جوش پیدا ہو۔ آج ہم اس تصویر کا دوسرا رخ بتاتے ہیں جو تقریباً ۷۰ سال سے لوگوں کی نظروں سے عمداً چھپا دیا گیا ہے۔

پشاور کا واقعہ

۱۵ جون ۱۸۵۷ء کو پشاور میں ۱۲۰ سپاہی پکڑے گئے۔ ان میں سے کسی نے بھی اپنے افسروں کو قتل نہیں کیا تھا۔ بہت سے آدمی ایسے تھے جو بغیر کسی مجرمانہ ارادے کے بغاوت میں شامل ہو گئے تھے۔ نکلسن نے ایڈورڈز ڈپٹی کمشنر پشاور کو لکھا تھا کہ میں ۵۵ سکھ قیدیوں کی جاں بخشی کی سفارش کرتا ہوں کیوں کہ مجھے ان کے افسروں نے یقین دلایا ہے کہ ان لوگوں نے بغاوت میں مطلق حصہ نہیں لیا۔ باقی کو توپ کے ذریعہ اڑا دیا جائے۔ سر لارنس نے جواب دیا کہ چوں کہ وہ ہمارے دشمنوں کی طرف سے لڑ رہے تھے، اس لیے ان پر رحم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی میں تمام آدمیوں کو پھانسی دینا نہیں چاہتا۔ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ ایسی عبرت ناک سزائیں دی جائیں کہ عوام الناس ڈر جائیں میری تجویز یہ ہے کہ ان میں سے صرف ایک تہائی کو سزائے موت دی جائے، اور تعداد ان سپاہیوں میں سے چنی جائے جو نہایت سرکش اور گستاخ ہوں۔ یا جن کے خلاف ان کے افسر شکایت کریں اگر ان صفات کے آدمی اتنے نہ ملیں جن سے مجوزہ تعداد پوری ہو سکے تو پھر بوڑھے سپاہیوں کو شامل کر لینا چاہیے۔ باقی قیدیوں کو مختلف قسم کی سزائیں دی جائیں۔ سزا کسی حالت میں بھی تین سال سے کم نہ ہو۔

لارڈ رابرٹ نے جو ان دنوں لفٹنٹ کے عہدے پر تھا، اپنی والدہ کو ایک خط میں اسی واقعہ کے متعلق لکھا ہے:۔

> "ہم جہلم سے پشاور تک پیادہ پا آئے۔ راہ میں باغیوں کو قتل کرتے رہے۔ اور فوجوں سے ہتھیار لیتے رہے۔ لوگوں پر سزائے موت کا جو توپ سے واقع ہو، بڑا اثر پڑتا ہے۔ یہ بڑا ہی خوفناک منظر ہے لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ان مظالم کے ذریعہ ہم ان بدمعاش مسلمانوں کو بتلا دینا چاہتے ہیں کہ ہم خدا کی مدد سے ہندوستان پر قابض رہیں گے۔"

پنجاب کے واقعات

ایک توپ میں بہت زیادہ بارود بھری ہوئی تھی۔ جب ایک شخص کو اس کے سامنے لاکر رکھا گیا اور توپ چل گئی، تو اس شخص کے سیکڑوں ٹکڑے ہوا میں اڑ گئے۔ اس کا سر تماشائیوں میں سے ایک کو جا لگا اور کئی آدمیوں پر خون کے چھینٹے پڑے۔ جنرل نکلسن جسے ہم ایام طفولیت میں دیوتا کی طرح پوجتے تھے۔ ایڈورڈ کو ایک خط میں لکھتا ہے:۔

"ہمیں ایک قانون بنانا چاہیے جس کی رو سے ہم انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کو زندہ جلا سکیں اور زندہ ہی ان کا چمڑہ اتار سکیں۔ محض پھانسی دینے سے ہمارا جذبۂ انتقام ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ میں چاہتا ہوں، دنیا کے ایک ایسے کونے میں ہوں جہاں قانون کو اپنے ہاتھ میں لے سکوں۔ مشرقی ممالک کا قاعدہ ہے کہ جب تک لوگوں پر گورنمنٹ کا دبدبہ اور خوف طاری نہ ہو جائے تب تک اس کے فوائد کی قدر نہیں کی جاتی۔"

کوپر جو امرتسر کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ لکھتا ہے کہ پنجاب کے تمام افسر ظلم کرنے میں ابتدا کرتے تھے تاکہ لوگ ڈر جائیں اور انتقام لینے کی جرات نہ کر سکیں۔

ٹامسن نے سر ہنری کاٹن کو چند مسلمان قیدیوں کے متعلق مندرجۂ ذیل واقعہ سنایا تھا۔

"شام کے وقت ایک سکھ اردلی آیا اور سلام کر کے کہا۔ میرے خیال میں حضور قیدیوں کو دیکھنا چاہتے ہوں گے۔ میں فوراً حوالات چلا گیا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ قیدی زمین پر بندھے ہوئے پڑے ہیں۔ بالکل برہنہ اور آخری سانس لے رہے ہیں۔ ان کے جسم کے ہر ایک حصے پر تانبا گرم کر کے نشان کیے گئے تھے۔ مجھے ان کی حالت پر رحم آیا اور پستول سے قتل کر دیا تاکہ جان کندنی کی تکلیف سے بچ جائیں۔"

جب کاٹن نے یہ درد انگیز واقعہ سنا تو ان سے پوچھا پھر تم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جنھوں نے یہ وحشیانہ حرکت کی تھی؟ ٹامسن نے جواب دیا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔

وحشیانہ قتل و نہب

غدر کے دنوں میں ہر ہندوستانی سپاہی کے خلاف الزام تھا کہ اس نے انگریز بچوں اور عورتوں کے قتل میں مدد دی ہے۔ خواہ وہ کسی جگہ پر ہو اور کتنا ہی بے علاقہ ہو، اگر کوئی انگریز دہلی میں قتل کیا گیا ہو، تو لاہور اور پشاور کے ہندوستانی سپاہی بھی قابل گرفت تھے۔

ایک چشم دید گواہ لفٹنٹ مجنڈی بیان کرتا ہے:۔

"ایک دفعہ سکھ اور انگریز ایک زخمی قیدی کو سنگینوں سے مار رہے لیکن کوئی ضرب مہلک ثابت نہ ہوئی۔ اس واسطے دو تین لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی گئی، اور اسے اس آگ میں پھینکا گیا۔ سکھ اور انگریز یہ خوفناک منظر بڑے مزے لے لے کر دیکھ رہے تھے۔"

رسل نے بھی جو ٹائمز لنڈن کا نامہ نگار تھا۔ اس واقعہ کی تصدیق کی ہے۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ "میں نے اس قیدی کی جلی ہوئی ہڈیاں بھی اس جگہ دیکھی تھیں۔"

سب سے پہلے اسی رسل نے ان وحشیانہ حرکات اور ظلم پر صدائے احتجاج بلند کی۔ چنانچہ وہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:۔

"یہ انتقامانہ سزائیں مثلاً مسلمانوں کو سور کے چمڑے میں ڈال کر سی دینا اور قتل کر دینے سے پہلے ان کے منہ میں سور کی چربی ڈالنا، اور ہندوؤں سے ان کے خلافِ مذہب حرکات کرانا۔ انسانیت کے خلاف اور تہذیب سے گری ہوئی حرکتیں ہیں۔ ان سزاؤں سے بڑے خوفناک نتائج پیدا ہونگے جو ہمارے واسطے مہلک ثابت ہونگے۔"

جب ان مظالم کی حد ہو گئی تو گورنر جنرل نے ۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء کو ایک مفصل حکم جاری کیا جس کی رو سے دیہات کا جلانا اور نہتے آدمیوں کو بغیر کسی ثبوت کے سزا دینا ممنوع قرار دیا گیا۔ تھانہ افسروں سے سزائے موت کے اختیارات بھی چھین لیے گئے جنھوں نے اندھا دھند یہ اختیارات برتے تھے، ۲۸ اگست کو جان گرانٹ صوبجات وسطی میں گورنر بنا کر بھیجا گیا تاکہ الہ آباد اور دیگر مقامات میں بے شمار آدمیوں کی پھانسی کی سزا ملتوی کر دے۔ انگریزوں نے کیننگ اور گرانٹ

کے خلاف بہت شور مچایا کیوں کہ انھوں نے بہت سے آدمیوں کو پھانسی سے بچایا تھا۔

ایک دفعہ اگست کے دنوں میں ایک انگریزی فوج دیہات جلاکر واپس آرہی تھی۔ راہ میں چند وفادار سپاہی مل گئے۔ مگر انھیں بھی سنگینوں سے مار دیا گیا۔

یہ مسلمہ امر ہے، کہ بہت سے سپاہی محض خوف کی وجہ سے بھاگ گئے اور پھر بغاوت پر مجبور ہو گئے۔ اگر ہم نے ابتدا میں مظالم نہ کیے ہوتے تو فساد دور تک نہ پھیلتا اور لوگ رحم و انصاف سے مایوس ہو کر باغی نہ ہو جاتے۔

ایک پادری کی بیوہ بڑے فخر سے لکھتی ہے:۔

"اس نے بہت سے قیدیوں کو گرجا صاف کرنے پر مامور کیا۔ لیکن چوں کہ یہ کام ان کے مذہب کے خلاف تھا اس لیے سنگینوں کی نوک سے کرانا پڑتا تھا بعض قیدیوں نے بڑی جلدی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ کیوں کہ انھیں خیال تھا کہ وہ اس طرح سے پھانسی سے بچ جائیں گے۔ لیکن ان کی یہ غلط فہمی فوراً دور ہو گئی کیوں کہ بالآخر سب کو پھانسی دی گئی۔"

مجنڈی ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"میں نے وہ رات مسجد (یعنی جامع مسجد دہلی) کی ناکہ بندی میں گزاری اور رات کا بہت سا حصہ ان قیدیوں کے قتل کرنے میں خرچ کیا۔ جو دن کے وقت پکڑے گئے تھے۔ بہت سے آدمیوں نے مرتے وقت ایسی شجاعت اور متانت دکھائی کہ ہم بھی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔"

ایک انگریزی افسر جو دہلی کے محاصرہ میں موجود تھا، لکھتا ہے:۔

"دشمن نے صلح کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ انگریز صلح کے خواہش مند نہیں ہیں وہ تو قتل عام سے خوش ہوتے ہیں۔"

"جب میجر رینالڈ کانپور کے لیے کوچ کر رہا تھا، جو جرنیل نیل نے اس کو مفصلہ ذیل ہدایات بھیجیں جو قابل غور ہیں:۔

" ان دیہات کو جنھوں نے بغاوت میں حصہ لیا ہے، تباہ کر دیا جائے۔ جن محلوں

میں پٹھان بود و باش رکھتے ہیں انھیں مسمار کر دیا جائے اور باشندے قتل کر دیے جائیں۔ باغی پلٹنوں کے تمام سپاہیوں کو پھانسی دی جائے چوں کہ فتحپور نے بغاوت کی ہے، اس لیے اس پر بھی حملہ کیا جائے اور تباہ کر دیا جائے اگر ڈپٹی کلکٹر گرفتار ہو جائے تو اسے پھانسی دے دی جائے اور اس کا سر شہر کی کسی بلند عمارت پر لٹکایا جائے۔"

بیگم اودھ نے ۱۹۵۸ء کے ایک اعلان میں یہ فقرہ لکھا تھا۔

"کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا کہ انگریز کوئی جرم معاف کر سکتے ہیں۔"

۵۰ ہزار جانوں کا قتل

آخر کار کیننگ اور جان لارنس نے بھی اس قتل عام کے روکنے کی کوشش کی۔ ڈزرائیلی (یعنی لارڈ بیکنس فیلڈ) نے تو ابتدا ہی سے اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ جب انگریزوں کا غضب جوش پر تھا تو اس نے ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ ہماری فوجیں ہندوستان کے لوگوں سے خوفناک انتقام لینگی۔ لیکن میں ان انگریز حاکموں کے اس طرز عمل سے بالکل متفق نہیں جن کے ہاتھ میں ہندوستان کی باگ ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ ہم غیر ممالک میں بجائے انصاف کے انتقام کے زور سے حکومت کریں۔ میں ظلم کے بدلے میں ظلم نہیں کرنا چاہتا۔"

لارڈ کیننگ نے ملکہ معظمہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"لوگ انتقام پر تلے ہوئے ہیں، اور وہ لوگ بھی جنھیں اپنے ماتحتوں کے روبرو بہتر مثال قائم کرنی چاہیے تھی، اس جوش سے خالی نہیں۔ میں جب اپنے لوگوں کی حرکات دیکھتا ہوں تو شرم کے مارے پسینہ پسینہ ہو جاتا ہوں۔ میں حیران ہوں کہ ان لوگوں نے کس طرح چالیس پچاس ہزار آدمی قتل کر ڈالے۔"

ملکہ وکٹوریہ نے اس خط کا جواب یہ دیا تھا۔

"لارڈ کیننگ کو یقین کرنا چاہیے کہ میں بھی انگریزوں کی ان وحشیانہ حرکات پر سخت نادم ہوں اور خاص کر انگلستان کی پبلک پر، جس نے برطانوی فوجوں کی کارگزاری بہ نظر تحسین دیکھی ہے۔"

چوں کہ لارڈ کیننگ نرم دل اور کمزور تھا اس لیے وہ وقت پر انگریزوں کا جوش ٹھنڈا نہ کر سکا۔ اس کے ماتحت اس کے اختیار سے باہر تھے۔

قتل و نہب کی مطلق العنانی

سر جارج کیمبل اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے:۔

"میں نے مارشل لا کے متعلق بہت دفعہ سنا ہے لیکن میں ابھی تک اس کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکا۔ ہندوستان میں ان دنوں اس کا جو مطلب سمجھا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ ہر ایک فوجی کو کھلی اجازت تھی وہ جسے چاہے قتل کرے یا جس سے جو کچھ چاہے چھین لے۔ کوئی روک ٹوک نہ ہوگی۔"

لارڈ کیننگ کی گورنمنٹ نے ۹ جون کو بعض صوبجات میں مارشل لا نافذ کیا تھا۔ گورنمنٹ کو چاہیے تھا کہ اس قانون کے استعمال کی سختی سے نگرانی کرے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ گورنمنٹ نے اس معاملہ میں سخت کمزوری دکھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماتحت افسر بلا روک ٹوک مظالم برپا کرتے رہے اور بغیر کسی تفتیش کے قتل عام جاری رہا۔

مسٹر رسل ٹائمز کا نامہ نگار ایک جگہ لکھتا ہے" اس غدر میں صرف سپاہیوں نے بغاوت کی تھی اس لئے مناسب یہی تھا کہ صرف وہی لوگ قتل کئے جاتے جنھوں نے اس میں حصہ لیا تھا، لیکن ان آدمیوں کو قتل کرنا جن کی ان فوجوں سے محض ہمدردی تھی ایک نہایت بزدلانہ فعل تھا۔ اگر کوئی کوئی باغی فوج کسی شہر میں مقیم ہوگئی تھی تو اس کے باشندوں کو محض اس بنا پر قتل کرنا، کیوں کہ ان کے شہر میں باغیوں نے ڈیرا ڈالا؟ کتنا وحشیانہ فعل ہے؟ یہ مسلم ہے کہ شہر کے باشندوں نے عام طور پر انگریزوں کے بچانے میں مدد دی تھی لیکن پھر بھی انگریزی فوجوں نے ان کی قدر نہ کی، اگر انگریز صرف باغیوں کو قتل کرتے تو پھر وہ حق بجانب ہوتے۔ لیکن بے شمار بے گناہ لوگوں کو محض اس وجہ سے قتل کیا گیا، کہ وہ ہندوستانی تھے۔"

(الہلال: ۲ ستمبر ۱۹۲۷ء)

غدر ۱۸۵۷ء اور تصویر کا دوسرا رُخ

(قسط دوم)

کوپر جو ان دنوں امرتسر کا ڈپٹی کمشنر تھا، اپنی کتاب "فسادات پنجاب" میں لکھتا ہے:۔

"۲۶ نمبر پلٹن نے ۳۰ جولائی کو لاہور میں بغاوت کر کے اپنے کمان افسر کو قتل کیا تھا۔ اس کی پاداش میں تمام سپاہی تہ تیغ کر دیے گئے۔"

۱۳ مئی کو ۳۸۰۰ ہندوستانی سپاہیوں سے احتیاطاً اسلحہ لے لیے گئے تھے، تقریباً تین ماہ تک ان پر سکھ اور انگریز پہرا دیتے رہے، ۳۰ جولائی کو سخت طوفان باد آیا اور قیدیوں میں غیر معمولی جوش و خروش پایا گیا۔ اس اثنا میں ایک سپاہی تلوار لے کر باہر آیا اور اپنے ساتھیوں کو للکار کر کہا۔ آؤ انگریزوں کو قتل کر دیں۔ چنانچہ اس نے جاتے ہی کمان افسر کو قتل کر دیا۔ اور تمام فوج طوفان کی اوٹ میں بھاگ نکلی۔ ان میں سے سیکڑوں سپاہی سکھوں اور انگریزوں کی گولہ باری سے مارے گئے تھے باقی ماندہ سپاہیوں نے دریائے راوی عبور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پولس نے مزاحمت کی۔ کوپر امرتسر سے ان کے تعاقب میں آیا۔ اس نے اپنی کتاب میں ان سپاہیوں کی حالت بیان کی ہے:۔

"دیہات کے لوگ دریا کے کنارے باغیوں کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر ہنس رہے تھے ان میں سے ایک سو پچاس آدمیوں کو انھوں نے قتل کر دیا اور سیکڑوں کو دریا میں ڈھکیل دیا۔ چوں کہ وہ ۴۰ میل سفر کر کے آئے تھے۔ اس لیے سخت تھکے ہوئے تھے اور دریا کے پانی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ناچار ڈوب گئے۔ باغیوں کی ایک خاصی تعداد دریا عبور کر کے ایک جنگل میں چھپ گئی تھی۔ کوپر نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دریا کو کشتیوں کے ذریعے عبور کیا۔ باغیوں کو خیال ہوا، ان کا کورٹ مارشل کیا جائے گا اور وہ بغیر کسی مزاحمت کے گرفتار کر لیے گئے۔ پھر انھیں پولیس اسٹیشن کے ایک کمرے میں بند کیا گیا۔ دوسرے روز سکھ رسے لے آئے۔ کوپر کے ہمراہیوں میں مسلمانوں کی بھی کچھ تعداد تھی۔ چوں کہ اسے شک تھا کہ شاید وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کریں۔ اس لیے انھیں رخصت دے دی گئی

تاکہ امرتسر میں جاکر عیدالضحیٰ منائیں۔ عیدالضحیٰ قربانی کا تیوہار ہوتا ہے۔ کوپر بھی ایک خاص قسم کی قربانی کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے پولیس اسٹیشن کے قریب ہی ایک خشک کنواں مل گیا۔ دس دس قیدیوں کو اکٹھا باندھا گیا اور باری باری باہر لاکر گولیوں کی بوچھاڑ سے مار دیا گیا۔ جب ۱۵۰ آدمی اس طرح مارے گئے، تو فائر کرنے والوں میں سے ایک بوڑھا آدمی بے ہوش ہو گیا۔ اس لیے مارنے والی جماعت کو کچھ عرصہ کے لیے آرام دیا گیا۔ پھر دوبارہ اسی طریقے سے قیدی مارے گئے، حتیٰ کہ مقتولین کی تعداد ۲۳۷ تک پہنچ گئی۔ اتنے میں افسر کو معلوم ہوا کہ بقیہ باغی اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلنا چاہتے۔ جب دروازہ کھولا گیا تو اتفاقاً بلیک ہول والے حادثے کا نقشہ سامنے موجود تھا، ۴۵ آدمی خوف، گرمی، اور سانس بند ہونے کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مر چکے تھے۔ ان تمام باغیوں کی لاشیں اسی کنوئیں میں پھینک دی گئیں اور اوپر سے مٹی ڈال دی گئی۔

اس حادثہ کی تمام تر ذمہ داری کوپر پر عائد ہوتی ہے۔ جس نے تن تنہا سکھ فوج کی مدد سے بے شمار مسلمانوں کو ظالمانہ طریقے سے تباہ کیا، اس میں شک نہیں کہ بعد میں اس کی حرکت پر بڑی لعن طعن کی گئی، لیکن محض زبانی لعن طعن سے کیا ہوتا ہے؟ لارنس نے جو پنجاب کا گورنر تھا (چیف کمشنر) تھا ایک خط میں اس کی بڑی تعریف کی ہے، وہ لکھتا ہے:-

"میں تم کو تمہاری بر کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ تم نے اور تمہاری پولیس نے بڑی جانبازی دکھلائی۔ گورنمنٹ تمہاری بہت مشکور ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ان باغیوں کا انجام دوسرے آدمیوں کے لیے کافی تنبیہ ہو گی۔ جو باغی ادھر ادھر منڈلا رہے ہیں انھیں پکڑنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ لارنس ۲ اگست ۱۸۵۷ء۔ لاہور۔"

لارنس کے بعد منٹگمری پنجاب کا لفٹنٹ گورنر مقرر ہوا۔ اس نے بھی اسی واقعہ کے متعلق کوپر

---

[1] یہ واقعہ اگر زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو تو سر جان لارنس کی سوانح عمری جلد دوم میں دیکھا جائے۔ (اہلال)

کو خط لکھا۔ جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"جو کچھ تم نے کیا بہت اچھا کیا۔ اس نازک وقت میں کسی حیلہ وحجت کی ضرورت نہ تھی۔ جب تک تم زندہ رہو گے یہ تمہارے واسطے عنوان شرف ہو گا۔ بقایا تین پلٹنوں میں بھی کچھ گڑبڑ ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ بغاوت نہیں کریں گے۔ میری خواہش ہے، کہ وہ بھی منحرف ہو جائیں، تاکہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچے۔ منٹگمری۔"

منٹگمری عیسائیت کی تبلیغ میں نمایاں حصہ لیا کرتا تھا۔ اس مذہب کی ضرب المثل نرم مزاجی اور حلم وبخشش کا سخت مداح تھا، لیکن اس نے بھی ایسے ظالمانہ فعل کی تائید کی۔ اس کے بعد اس نے ہاڈسن کو ایک چھٹی لکھی یہ وہ شخص تھا جس نے بہادر شاہ کے لڑکوں کو سخت بے رحمی سے قتل کیا تھا۔ انگریز مورخین میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہو گا جس نے ہاڈسن کے اس فعل کی مذمت نہ کی ہو۔ لیکن منٹگمری اسے لکھتا ہے:۔

"میرے پیارے ہاڈسن۔

میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں کہ تم نے بادشاہ کو گرفتار کر لیا اور اس کے بیٹوں کو قتل کر دیا۔ میں امید کرتا ہوں تم اسی طرح اور شہزادے بھی قتل کرو گے۔ منٹگمری۔"

ایک آدمی اتنا مجروح تھا کہ وہ مقتل پر جانے کے قابل نہ تھا۔ منٹگمری کی ہدایت کے مطابق سے سرکاری گواہ بنایا گیا۔ چنانچہ کوپر کو مفصلہ ذیل خط لکھا ہے:۔

"مجروح مذکور کو لاہور بھیج دیا جائے تاکہ وہ خود اپنی زبان سے امرتسر کے واقعات بیان کرے۔ بغیر اس کے کوئی شخص اعتبار نہیں کرے گا، ۲۶ پلٹن کے بعض آدمی ایسے بھی ہوں گے جو آوارہ پھر رہے ہوں گے۔ ان سب کو گرفتار کر کے ہماری طرف بھیجدو۔ تم کافی تعداد میں قتل کر چکے ہو، اب ہمیں اپنی فوجوں کے لیے کچھ آدمی چاہئیں۔"

ایک کے بدلے ۵۰۰

اس مجروح قیدی اور ۱۴۱ آدمیوں کو لاہور بھیجدیا گیا۔ جہاں وہ بے دریغ قتل کر دیے

گئے۔ کوپر خود اقبال کرتا ہے کہ کمان افسر کے قتل کے بعد دو دن کے اندر، اس کے بدلے ۵۰۰ آدمیوں کا خون بہایا گیا۔

کانپور میں ایک کنواں ہے جہاں چند انگریزوں کو قتل کر کے پھینک دیا گیا تھا۔ لیکن اجنالے میں بھی ایک کنواں ہے جہاں سیکڑوں ہندوستانی قتل کر کے پھینک دیے گئے۔

رسل اپنی ڈائری میں لکھتا ہے :-

"ایک افسر نے جو رینالڈ کی فوج کے ساتھ مقرر تھا۔ مجھ سے ذکر کیا کہ ہندوستانیوں کو اندھا دھند قتل کیا جاتا تھا، دو دن کے عرصے میں ۴۲ آدمی کو سڑک کے کنارے پھانسی دی گئی۔ مقتولین میں وہ لوگ تھے جو پلٹن کو اس کی راہ میں مل جاتے تھے۔ ۱۲ آدمیوں کو محض اس وجہ سے پھانسی دی گئی کہ جب پلٹن کوچ کر رہی تھی تو ان کے منہ سڑک کی طرف نہ تھے۔ دوسری طرف دیکھ رہے تھے۔ جو گاؤں راہ میں آتا تھا، جلا دیا جاتا تھا۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ یہ افسوسناک واقعات کانپور کے حادثہ سے بہت پہلے ہوتے تھے۔ اگر ہندوستانیوں کا یہ قتل عام کانپور کے واقعہ کے بعد ظہور پذیر ہوتا تو پھر بھی ہم لوگ شاید حق بجانب ہوتے۔ افسر مذکور نے ان مظالم کے روکنے کی کوشش کی اور رینالڈ سے کہا کہ اگر یہی حالت رہی تو لوگ دیہات خالی کر کے بھاگ جائیں گے اور فوج کے لیے خورد و نوش کا سامان ملنے میں سخت دقت واقع ہو گی۔ بالآخر یہی ہوا جہاں کہیں فوج جاتی تھی دیہات بالکل ویران ہو جاتے تھے۔ لوگ غلہ دینے سے گھبراتے کیوں کہ انھیں علم تھا کہ اگر انھوں نے یہ نیک کام کیا تو پھر بھی انھیں پھانسی ضرور دی جائے گی۔"

ایک پادری لکھتا ہے :-

"انگریز ہندوستانیوں سے اس قدر نفرت کرتے ہیں کہ اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کے ملازم بھی جو عام طور پر غدر کے زمانہ میں وفادار رہے تھے، ان کی بدسلوکی اور بے رحمی سے نہ بچ سکے۔ لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ پھر بھی ان

کی وفاداری اور نمک حلالی میں فرق نہ آیا۔ بہت سے ڈولی بردار اور سائیس جو ہماری نوکری میں زخمی ہوئے تھے، زمین پر پڑے سسک رہے تھے۔ مگر کسی نے علاج معالجہ کی مطلق پرواہ نہ کی۔ وہ دن کے وقت دھوپ میں پڑے رہتے رات کے وقت سردی میں۔ جب دہلی کے باشندوں کا قتل عام ہوا، تو ان میں سے بہت سے ایسے آدمی تھے جو ہماری کامیابی پر خوش تھے اور ہماری فتح یابی کے لیے دعائیں مانگتے تھے، لیکن ان کی بھی دعائیں ان کے واسطے مہلک ثابت ہوئیں۔ بعض نوجوان انگریز تو ہندوستانیوں کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے وہ علانیہ طور پر کہتے تھے "تمام خدمت گاروں اور پوربیوں کو جو کیمپ میں ہیں تہ تیغ کر دیا جائے" یہ وہ ملازم تھے جنھوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ہماری خدمت کی تھی۔"

ونسنٹ آسمتھ نے بھی اپنی تاریخ ہند میں تسلیم کیا ہے کہ بہت سے ہندوستانیوں نے ہماری جان بچانے کی خاطر اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

کے KAYE اپنی کتاب میں قتل عام سے پیشتر کے واقعات یوں لکھتا ہے:۔

"مارشل لا کو جاری ہوئے عرصہ ہو گیا ہے وہ ظالمانہ قانون جو مئی اور جون میں مجلس مقننہ نے پاس کیے تھے، بڑی شدت سے اپنا کام کر رہے تھے۔ فوجی اور سول افسر ہندوستانیوں کو بلا تمیز قتل کر رہے تھے۔ گورنر جنرل نے جو خط و کتابت پارلیمنٹ سے ان دنوں کی تھی، اس میں درج ہے کہ بے گناہ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا جاتا تھا، دیہات جلائے جاتے تھے ان کے باشندوں کو بھی انہی میں جلا دیا جاتا تھا۔ انگریز فخریہ طور پر کہا کرتے تھے۔ ہم نے کوئی آدمی بھی قتل کیے بغیر نہیں چھوڑا۔"

واقعات قبل از حادثہ کانپور

ایک دفعہ چند چھوٹے لڑکے محض شرارتاً، باغیوں کا سا لباس پہن کر ڈھول بجانے لگے۔ انھیں گرفتار کر کے مقدمہ چلا گیا اور فوجی عدالت نے سزائے موت کا حکم سنایا۔ ایک انگریز افسر

جو کورٹ مارشل کا رکن تھا، روتا ہوا کمان افسر کے پاس گیا اور ان کی جاں بخشی کی سفارش کی۔ لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی، اور ان معصوم بچوں کو پھانسی دے دی گئی۔

دیہات میں انگریزوں کی جماعتیں چکر لگاتی تھیں، جو کوئی ملتا تھا اسے کسی درخت پر لٹکا کر پھانسی دے دی جاتی تھی۔

پٹنہ میں مسٹر ٹیلر کمشنر کا گواہ بنانے کا عجیب طریقہ تھا۔ اس نے ایک قیدی سے کہا اگر تم مجھے تین ایسے آدمیوں کے نام بتا دو جو واجب القتل ہوں تو میں تمہاری جان بخش دوں گا لیکن اس نے ایسے آدمیوں کے نام لیے جن کے نام سے وہ خود بھی واقف تھا، اس لیے قیدی قتل کیا گیا۔

آگرہ اور سہارن پور میں بھی پھانسی کا رواج بڑے زوروں پر تھا۔ دیہاتی لوگ گروہ در گروہ گرفتار کر کے لائے جاتے تھے ان میں بہت تھوڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہو گی جنھوں نے بغاوت میں حصہ لیا ہو گا لیکن تمام قیدی فی الفور بغیر کسی تحقیقات کے قتل کر دیے جاتے تھے۔

دہلی ۱۴ ستمبر ۵۷ء کو فتح کی گئی۔ مسز کوپلینڈ بیان کرتی ہے کہ ایک ہفتے کے اندر کمان افسر نے چار پانچ سو آدمی بے دریغ قتل کر ڈالے۔ گورے سپاہی ان خوفناک مناظر میں نہایت دلچسپی لیتے تھے۔ نواب جھجر کو بھی انہی دنوں میں پھانسی دی گئی، لوگ کہتے ہیں کہ اس نے بڑی دیر کے بعد جان دی۔

ایک دفعہ ایک جوہری مسٹر گارسٹن کے پاس سامان بیچنے کے لیے آیا۔ مسٹر گارسٹن نے کہا تم بہت زیادہ قیمت مانگتے ہو، میں ابھی تمہیں مٹکاف صاحب کے حوالے کر دوں گی۔ وہ اس نام سے ایسا مرعوب ہوا کہ سامان چھوڑ کر بھاگ گیا، اور پھر واپس نہ آیا۔ مٹکاف سے ہندوستانی سخت ڈرتے تھے۔ کیوں کہ جو کوئی اس کی گرفت میں آتا ہے، وہ اسے قتل کر دیتا ہے۔"

کورٹ مارشل کسی پر رحم نہیں کرتی تھی جو کوئی گرفتار ہوتا تھا ضرور ہی قتل کر دیا جاتا تھا۔ شہر کے چوک میں ایک بڑی پھانسی کھڑی کی گئی تھی۔ ۵، ۶ آدمی ہر روز پھانسی دیے جاتے تھے انگریز افسر بڑی متانت سے پاس بیٹھ کر یہ مناظر دیکھا کرتے تھے۔

گورنر جنرل نے ۲۴؍دسمبر ۱۸۵۷ء کو جولائی کے واقعات کے متعلق ایک مفصل رپورٹ لکھی تھی. ذیل میں اس کا اقتباس دیا جاتا ہے:۔

"اس زمانہ میں سب لوگ بلا امتیاز پھانسی دیے گئے۔ ان میں ایسے آدمی تھے جن کے برخلاف محض شک تھا۔ سیکڑوں دیہات لوٹے گئے، اور بعد ازاں جلا دیے گئے۔ ان خوفناک حرکات سے وہ قومیں بھی سخت ناراض ہو گئیں جو حکومت کی وفادار تھیں۔ شمالی ہند میں قحط پڑ گیا۔ کیوں کہ ایسی اندھیر نگری میں باقاعدہ کاشت کاری کا کرنا ناممکن تھا، جو سپاہی رخصت پر گھر آئے تھے یا جو پلٹنوں کے ٹوٹ جانے کے بعد اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے اور جنھوں نے بغاوت میں مطلقاً کوئی حصہ نہیں لیا تھا بلکہ انگریزوں کی جان بچانے میں مدد کی تھی، ان سب کے ساتھ انگریزی فوجیں وہی سلوک کرتی تھیں جو باغیوں سے کیا جاتا تھا۔ گورنمنٹ کے ماتحت افسروں کی ان افسوسناک حرکات سے ملک میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ گورنمنٹ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بیخ کنی پر اب تل گئی ہے۔"

مجنڈی لکھتا ہے:۔

"گورنمنٹ محض پھانسی اور قتل عام کی وجہ سے چل رہی تھی۔ جب لکھنؤ فتح کیا گیا تو بے شمار آدمی پھانسی پر چڑھا دیے گئے۔ اس وقت یہ تمیز نہیں کی جاتی تھی، کہ آیا قیدی سپاہی ہے یا اودھ کا کسان ہے؛ صرف اتنی بات کافی ہے کہ چہرا سیاہ ہو۔"

مارٹن نے بمبئی ٹیلیگراف میں ایک مراسلہ بھیجا تھا جس کا مضمون یہ ہے:۔

"جب ہماری فوج دہلی میں داخل ہوئی تو جو آدمی فصیل کے اندر ملا، اسی جگہ سنگینوں سے مار دیا گیا۔ مقتولین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کیوں کہ کئی گھروں میں سے ۴۰۔ ۴۰۔ ۵۰۔ ۵۰ آدمی پکڑے گئے، یہ لوگ باغی نہیں تھے۔ شہر کے باشندے تھے۔ انھیں کامل امید تھی کہ انھیں معاف کر دیا جائے گا، لیکن وہ سخت مایوس ہوئے۔"

ہومز اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"بے گناہ آدمی مارے جاتے تھے وہ جان بخشی کے لیے ہاتھ جوڑتے تھے۔ بوڑھے آدمی جو خوف اور عمر کی وجہ سے کانپتے تھے، گاجر مولی کی طرح کاٹے جاتے تھے لیکن انگریزوں کو بھی کافی اشتعال دلایا گیا تھا۔ کیوں کہ ان کے چند آدمی شہر کی گلی کوچوں میں مارے گئے تھے۔"

یہی مصنف بیان کرتا ہے کہ جوں ہی ہم دہلی میں داخل ہوئے لوٹ مار شروع ہو گئی۔ جو ہندوستانی ملتا تھا گولی سے مار دیا جاتا تھا۔ شراب خانے اور دیگر دکانیں لوٹ لی گئیں ، اور انگریزوں نے شراب پی کر جہاں کہیں ہندوستانیوں کا مجمع دیکھا، ان پر ٹوٹ پڑے۔ ایسی حالت میں بیچارے باشندے کیا کرتے؟ کیا وہ انگریز سپاہیوں کو پکڑ کے کمان افسر کے پاس لے جاتے؟ لیکن وہاں تو یہ حال تھا کہ کمان افسر سے لے کر معمولی سپاہی تک، سب ہندوستانیوں کے خون کے پیاسے تھے۔"

مسٹر مارٹن جو ٹائمز کا نامہ نگار تھا، ۱۶ر نومبر ۵۷ء کو لکھتا ہے:۔

"کل میں اور ایک افسر مع ۲۰ سپاہیوں کے شہر میں چکر لگا رہے تھے۔ ہم نے ۱۴ مقتول عورتیں دیکھیں۔ جن کے گلے ان کے شوہروں نے کاٹ ڈالے تھے اور ان کے اوپر چادریں ڈھانپ دی تھیں۔ ہم نے ایک آدمی سے دریافت کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا ان کے خاوندوں نے اس واسطے قتل کر دیا ہے کہ مبادا یہ عورتیں انگریزوں کے قابو میں آجائیں کیوں کہ وہ یہ بےعزتی برداشت نہیں کر سکتے۔ پھر اسی آدمی نے ان کے شوہروں کی لاشیں دکھائیں۔ جنھوں نے اس فعل کے بعد اپنے آپ کو قتل کر دیا تھا۔ اس شہر نے نادر شاہ کے قتل عام کے بعد ایسے خوفناک مناظر کبھی نہیں دیکھے تھے۔ جس دن دہلی فتح ہوئی، وہ لوگ جو ہمارے خلاف لڑ رہے تھے، شہر سے نکل کر بھاگ گئے تھے۔ صرف وہ لوگ رہ گئے تھے جنھوں نے بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ بلا امتیاز

قتل کیے گئے۔"

آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا نے جو ایک اعلیٰ پایہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے، یہ واقعات قطعاً نظر انداز کر دیے ہیں۔ اس نے صرف معمولی طور پر ایک مہذب فوج کے داخلۂ شہر کا ذکر کیا ہے، لیکن یہی تاریخ نادر شاہ کے قتل عام کی بڑی مہیب تصویر دکھلاتی ہے۔ حالاں کہ نادر شاہ کا قتل عام اس غدر کے قتل عام کے مقابلہ میں کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ نادر شاہ کا قتل عام صرف چند گھنٹے رہا تھا، اور یہ کئی ہفتوں تک جاری رہا۔

حادثۂ کانپور

بعض انگریز مورخ کہتے ہیں کہ چوں کہ باغیوں نے کانپور میں انگریزوں پر ظلم ڈھائے تھے، اس لیے وہ انتقام لینے میں حق بجانب تھے۔ میں ذیل میں کان پور کے حادثہ کے متعلق چند واقعات درج کرتا ہوں۔ ان سے ناظرین خود اندازہ لگائیں گے کہ صورت حال کیا تھی۔

سر جارج فارسٹ نے اپنی کتاب "ہندوستانی بغاوت" میں لکھا ہے:۔

"یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ ان سپاہیوں نے جو انگریز قیدیوں کی حراست پر مامور تھے، انھیں قتل کرنے سے انکار کر دیا تھا، یہ ظالمانہ فعل نانا کے ۵ بدمعاش ہمراہیوں میں سے ایک کنجڑے کی ایما سے سرزد ہوا تھا۔ اس فعل کی ذمہ داری کسی صورت میں بھی تمام ہندوستانی قوم پر عائد نہیں ہو سکتی۔ جب کوئی انگریز کسی تاریخ میں پڑھتا ہے کہ مسز جیمز یا مسز جینگز کو کسی ہندوستانی نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تو اس کے غصے کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ لیکن دوسری طرف یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ سیکڑوں عورتیں اور بچے انگریزی فوجوں کی بدولت اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ اگر ہمیں ایک انگریز لیڈی کے خوفناک انجام سے ہمدردی ہے تو ہمیں یہ بھول نہ جانا چاہیئے کہ ہندوستان کے باشندے بھی آخر انسان تھے کانپور کے کنوئیں کا حادثہ کوئی آدمی پسند نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس ہیولاک باغیوں کو شکست دے کر کانپور کی طرف بڑھ رہا تھا، اور باغیوں نے

جب ہمارے قتل و سلب کی شہرت سنی تو انھوں نے بھی اشتعال میں آکر قیدیوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جیسا کہ ان کے بھائیوں اور بہنوں سے ہو رہا تھا۔"

ان دنوں یہ عام افواہ ہمارے لوگوں نے مشہور کر رکھی تھی کہ ہندوستانیوں نے انگریز عورتوں کی عصمت دری کی اور پھر انھیں قتل کر دیا، سر جارج کیمبل ان تمام روایات کو بے بنیاد قرار دیتے ہیں اور تمام مشہور مورخ ان کی تائید کرتے ہیں۔

(مترجمہ محمد علی وکیل ایبٹ آباد)

(الہلال: ۹ ستمبر ۱۹۲۷ء)

شخصی آزادی

حال میں مندرجہ صدر موضوع "الحریت الشخصیہ" پر ایک نہایت مفید اور دلچسپ مجموعۂ مقالات مصر میں شایع ہوا ہے جس کے مقالہ نگاروں نے کوشش کی ہے کہ اس باب میں جس قدر مختلف نقطہ ہائے نظر اور سیاسی مذاہب موجود ہیں، انھیں صحت بیان کے ساتھ واضح کر دیا جائے۔ "شخصی آزادی" کے باب میں اگرچہ بے شمار افکار و آرا موجود ہیں، لیکن اہم اور اصولی مذاہب تین ہیں:

(۱) "مذہب تقید علی الاطلاق" یعنی وہ مذہب جو کامل شاہیت اور شاہی استبداد کے کے اعتراف کا نتیجہ ہے، اور جو کہتا ہے کہ کسی فرد واحد کو اپنے مالکوں اور آقاؤں کے خلاف مطالبۂ آزادی کا حق ہی نہیں ہے۔

(۲) "مذہب استقلال مقید و مشروط" جو اس وقت عملاً تمام ان ممالک کی ہیئت اجتماعیہ کا مذہب ہے، جو دستوری یا جمہوری حکومت کے طریقوں پر عامل ہو چکے ہیں۔ اس مذہب کے معتقدین شخصی آزادی کا مطالبہ ہر فرد کا فطری حق قرار دیتے ہیں، مگر ساتھ ہی جماعت، قوم، اور نظم کے مشترک مقاصد کی بالاتری بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے اعتقاد میں ہر فرد کو آزاد ہونا چاہیے، لیکن اسی حد تک، جس حد تک جماعت، قوم، اور حاکمانہ نظام کا مزاج موافقت کرے۔

(۳) "مذہب استقلال فردی علی الاطلاق" جو فرد کے حقوق آزادی کو اصل قرار دے کر ہیئت اجتماعیہ کا تمام نظام اس کے مطابق رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے معتقدین ان تمام قیود اور شرائط کے اعتراف سے انکار کرتے ہیں جو کسی حال میں بھی فرد کی انفرادی آزادی کے خلاف ہوں۔

پہلا مذہب یک قلم متروک و مہجور سمجھا جاتا تھا، لیکن اٹلی کے فیسٹی سیزم نے پھر اسے

زندہ کر دیا ہے۔

ہم اس مجموعہ سے پہلے ایک مقالہ دوسرے مذہب کی تائید میں (جو وقت کا عام اور معمول بہ مذہب ہے) حذف و اضافہ کے بعد نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد تیسرے مذہب کے موید وافکار و مباحث نقل کریں گے تاکہ قارئین الہلال اس اہم موضوع کے تمام اطراف پر نظر ڈال سکیں۔

شخصی آزادی کے معنی کیا ہیں؛ لوگوں کو اس کے شرح و بیان میں سخت ٹھوکریں لگی ہیں۔ شخصی آزادی کا مفہوم عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ہر فرد اپنی ہر طلب بے روک ٹوک پوری کر سکے۔ اس غلط فہمی کا بڑا سبب، حکام کا طرز عمل ہے۔ مطلق العنانی اور ذاتی مفاد کے مقابلے میں رعایا کے فوائد سے بے پروائی، انھوں نے اپنا شعار بنا لیا۔ اس غلو کا نتیجہ یہ نکلا کہ محکوموں میں بھی غلو پیدا ہو گیا۔ انتہائی استبداد کے مقابلے میں انتہائی آزادی کا مطالبہ شروع ہوا۔ اور اس طرح شخصی آزادی کا صحیح مفہوم بدل گیا۔

اس غلو نے بالآخر یہ اصول پیدا کیا ہے کہ "حکومت اور آزادی یک جا جمع نہیں ہو سکتی" اس اصول کے ماننے والوں کا استدلال یہ ہے کہ حکومت سے مقصود ملک میں ایسے حاکم اعلیٰ کا وجود ہے، جس کی اطاعت تمام افراد کے لیے ضروری ہو۔ وہ قانون بنائے، قانون کی پابندی پر مجبور کرے، مخالفوں کو سزائیں دے، محصول لگائے، رعایا کی مرضی کے خلاف اعلان جنگ کر دے، اور قتل و خونریزی کا بازار گرم ہو جائے، وہ کہتے ہیں، اس صورت میں کسی فرد کی بھی شخصی آزادی محفوظ نہیں رہ سکتی۔

(مذہبِ استقلال فردی)

اس اصول کے قائل ہر قسم کی حکومت کے خلاف ہیں۔ ان کے خیال میں حکومت کی موجودگی افراد کو ان کی کامل آزادی سے محروم کر دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں، ہر فرد کو اپنی خواہشیں پوری کرنے میں کامل آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ کسی کو بھی اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کا

حق نہیں ہے۔ یہ آزادی درحقیقت مذہب استقلال فردی یا مذہب عقد اجتماعی (سوشل کنٹریکٹ) کے ماننے والوں کی آزادی ہے۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ حکومت کے وجود سے پہلے افراد کو کامل آزادی میسر تھی۔ پھر انھوں نے حاکم اعلیٰ کو اپنی آزادی کا کچھ حصہ اس شرط پر دے دیا کہ وہ اس کے معاوضہ میں ان کے حقوق کی حفاظت و حمایت کرے۔ یہ خیال دراصل سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے بادشاہوں کے قہر و استبداد کی وجہ سے پیدا ہوا، سیاست اس زمانہ کے علماء نے کہا "حاکم کی قوت و اختیار، ذاتی و طبیعی نہیں ہے بلکہ رعایا کی بخشی ہوئی ہے۔"

غور و بحث کے بعد ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ آزادی صرف اسی شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جس کے متعلق فرض کر لیا جائے کہ اسے ایسی غیر محدود قوت و قدرت حاصل ہو گئی ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی ہر خواہش بے روک ٹوک پوری کر سکتا ہے۔ اس آزادی کے دلدادہ کہتے ہیں کہ ہر فرد کو حق ہے کہ اپنی تمام خواہشیں جس وقت اور جس طرح چاہے پوری کرلے۔ اس آزادی کا تصور ایسی حالت میں ہرگز نہیں ہو سکتا جب کہ ایک ہی غرض کے حصول کے لیے متعدد افراد کھڑے ہوں۔ ہر شخص اسے صرف اپنے ہی لیے لینا چاہے۔ ظاہر ہے، ایسی صورت میں یہ خیالی آزادی قائم نہیں رہ سکتی۔ ضرور تصادم ہوگا۔ زیادہ طاقتور غالب آئے گا۔ کمزور مغلوب و محروم رہیں گے، اور ان کی آزادی سلب ہو جائے گی۔

(مشروط آزادی)

فرد کو زیادہ سے زیادہ اتنی آزادی مل سکتی ہے کہ وہ اپنے تمام افعال میں آزاد ہو جب تک کہ دوسروں کی آزادی اس کی آزادی کی وجہ سے خطرے میں نہ پڑے۔ فرانس کے انقلابیوں نے بھی اپنے ۱۷۸۹ء کے اعلان میں آزادی کی یہی تعریف کی تھی:-

"آزادی ایک قوت ہے جس سے انسان اپنی ہر خواہش پوری کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کی خواہش دوسروں کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔"

ہربرٹ اسپنسر نے بھی آزادی کی تعریف یہ کی ہے:- "ہر شخص آزاد ہے، جو چاہے

کرے، بشرطیکہ اپنے فعل سے دوسروں کی آزادی پر دست درازی نہ کرے۔"

یہ جائز آزادی ہے اور حکومت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ بلکہ بغیر حکومت کے اس کا وجود مشکل ہے۔ یہ آزادی اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کی پشت پناہی پر ایک حاکمانہ نظام موجود ہو۔ اس آزادی کی اولین شرط یہ ہے کہ دوسروں کی آزادی اور حقوق پر دست درازی نہ ہونے پائے۔ لہذا ایک بالاتر قوت کا وجود لازمی ہے جو ہر فرد کے حقوق معین کر دے۔ ان کی حفاظت و حمایت کی ذمہ دار بن جائے، اور ہر قسم کی زیادتی روک سکے۔ پس جائز شخصی آزادی، نظام حکومت ہی کے ذریعہ پائی جا سکتی ہے۔ اس آزادی کو سیاسی اصطلاح میں "شہری آزادی" کے نام سے پکارتے ہیں۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ حکومت کا اہم ترین فرض، شخصی آزادی کی ضمانت ہے۔ لیکن اس بارے میں بھی علماء سیاست کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ حکومت کا فرض صرف اسی قدر ہے کہ افراد کی شخصی آزادی کی دور سے حفاظت کرے مگر خود اس میں دخل نہ دے۔ چنانچہ وہ حکومت کے لیے جائز نہیں سمجھتے کہ افراد کے ذاتی معاملات میں کسی قسم کی بھی مداخلت کرے۔ ان کے خیال میں افراد کو اپنے بچوں کی تعلیم پر مجبور کرنا، زراعت کے خاص طریقے جاری کرنے، کارخانوں کے لیے قواعد قرار دینا، مزدوری کی شرح مقرر کرنا، یہ، اور اس قسم کے دوسرے کام، حکومت کے لیے ناروا ہیں۔ وہ کہتے ہیں حکومت کو صرف وہ کام کرنے چاہئیں جن سے افراد کی شخصی آزادی محفوظ رہے۔ مثلاً اسے فوج مرتب کرنا، قلعے بنانا، اور جنگی بیڑے طیار کرنے چاہئیں، تاکہ دوسری قومیں ملک کی آزادی پر حملہ نہ کر سکیں۔ اسی طرح پولیس اور دیوانی اور فوجداری عدالتیں وغیرہ رکھنا بھی جائز ہے تاکہ افراد کے حقوق محفوظ رہیں۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ حکومت پر کوئی پابندی عاید نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں حکومت کو وہ تمام کام کرنے چاہئیں جن سے افراد یا جماعت کی بھلائی متصور ہو۔

(وطنی اور آئینی آزادی)

علم سیاست میں "استقلال فردی" اور "مشروط آزادی" کے علاوہ ایک قسم "وطنی آزادی"

کی بھی ہے۔ اس سے مقصود قوم کی خود مختاری ہے۔ جب کوئی قوم اپنی خود مختاری حاصل کر لیتی ہے تو کہا جاتا ہے، اس نے "وطنی آزادی" پالی۔

آزادی کی ایک چوتھی قسم بھی ہے اور اسے سیاست کی اصطلاح میں "دستوری آزادی" کہتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ قوم پر ایک ایسی حکومت قائم ہو جسے خود قوم ہی نے منتخب کیا ہو، اور قوم کے سامنے ذمہ دار اور جوابدہ ہو، جیسی کہ ولایات متحدہ امریکا، فرانس، اور انگلستان وغیرہ کی حکومتیں ہیں۔

(سلطنت اور حکومت)

یہاں یہ جاننا بھی مناسب ہے کہ سلطنت (اسٹیٹ) اور حکومت (گورنمنٹ) میں کیا فرق ہے؟ سلطنت سے مقصود یہ ہے کہ کسی محدود خطہ میں انسانی افراد کی کوئی جماعت آباد ہو اور اس پر کوئی حکمراں قوت موجود ہو، عام اس سے کہ حکمراں قوت اکثریت کے ہاتھ میں ہو، یا اقلیت کے ہاتھ میں، یا فرد واحد کے ہاتھ میں۔ یہ قوت باقی تمام لوگوں پر غالب و حاوی ہو۔ لہذا سلطنت کے موجود ہونے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں: حکم اور اطاعت، جہاں کہیں حکم کرنے والی قوت اور اطاعت کرنے والی جماعت موجود ہو، کہا جائے گا کہ سلطنت موجود ہے۔ یا یوں سمجھو کہ سلطنت، حاکم اور محکوم کے مجموعہ کا نام ہے۔ رہی حکومت تو وہ اس شخص یا جماعت کا نام ہے جس کے ہاتھ میں حکمراں قوت ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ "مشروط آزادی" (اور یہی شہری آزادی ہے) کی حفاظت کا ذمہ حکومت کے سر ہے۔ لیکن اگر حکومت کسی مستبد اور ظالم شخص کے ہاتھ میں ہو گی تو وہ اپنی مرضی کے مطابق افراد کی آزادی اور حقوق پر دست درازی کر سکتا ہے۔ دستوری حکومتوں میں استبداد کا اتنا خطرہ نہیں ہے۔ لیکن ان میں بھی شخصی آزادی کی ضمانت یکساں نہیں ہوتی۔ اس ضمانت کا تعلق براہ راست، دستور حکومت سے ہوتا ہے۔ جن ملکوں کا دستور حکومت زیادہ مستحکم ہوتا اور مشکل سے بدلا جا سکتا ہے، وہاں شخصی آزادی سب سے زیادہ محفوظ رہتی ہے۔ یہ اس لیے کہ اگر دستور حکومت آسانی سے بدلا جا سکتا ہے تو شخصی آزادی پر بھی

آسانی کے ساتھ دست درازی کی جا سکتی ہے۔

سب سے زیادہ مشکل تبدیلی امریکا کے دستورِ حکومت کی ہے۔ اس تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ ملک کی دو تلث آبادی کی منظوری لی جائے۔ یعنی مجلس حکومت کے دو تلث ممبروں کی رضامندی ضروری ہے۔ لیکن دوسرے ممالک مثلاً انگلستان میں دستور کی تبدیلی اتنی مشکل نہیں ہے۔ وہاں پارلیمنٹ کو اختیار ہے، جب چاہے، تھوڑی سی اکثریت پیدا کر کے بدل ڈالے۔

بنابریں امریکا کا نظام حکومت دنیا کے تمام ملکوں کے موجود نظام حکومت سے زیادہ بہتر اور شخصی آزادی کے لیے زیادہ ضمانت رکھنے والا سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں جتنی شہری آزادی موجود ہے، اتنی روئے زمین پر کسی دوسرے ملک میں موجود نہیں۔ البتہ روس کا نیا انقلاب اس سے مستثنیٰ ہے۔

(حکومت اور افراد)

حکومت کو افراد پر کس قسم کا اقتدار حاصل ہونا چاہیے؛ اس کے سمجھنے کے لیے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ فرد اور سلطنت یا قوم کے درمیان کیا تعلق ہے؛

"مذہب استقلال فردی" کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ سلطنت یا قوم میں فرد، مستقل مرکزی حیثیت رکھتا ہے، اور یہ کہ تمام افراد نے باہم معاہدہ کر کے اپنے تئیں اس اثر پر حاکم کے حوالہ کر دیا ہے کہ وہ ان کی شخصی آزادی کی حفاظت کرے اور دوسرے افراد کی دست درازیاں روکے۔ لہٰذا حکومت کا اقتدار و اختیار صرف اسی دائرے میں محدود ہے۔ یعنی زیادتی کا روکنا۔ اٹھارویں صدی کے علمائِ سیاست میں اس مذہب نے بہت مقبولیت حاصل کی تھی، مگر بعد میں عملاً متروک ہو گیا۔

علمائِ سیاست کا ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ فرد اور سلطنت کا باہمی تعلق ایک مضبوط طبیعی تعلق ہے۔ یہ تعلق ویسا ہی ہے، جیسا مختلف اعضاء کا جسم سے ہوتا ہے۔ جس طرح ہاتھ جسم سے کٹ کر باقی نہیں رہ سکتا، اسی طرح فرد، سلطنت یا قوم سے علیحدہ ہو کر زندہ نہیں رہ

سکتا۔ اس گروہ کا خیال ہے کہ سلطنت اس وقت سے موجود ہے، جب سے انسان کی جماعتی زندگی کا آغاز ہوا ہے۔ شروع میں جب انسان ابتدائی وحشت کی حالت میں تھا، تو اس وقت سلطنت بھی بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔ اس زمانہ میں قبیلہ ہی سلطنت تھی۔ کیوں کہ سلطنت کی یہ تعریف کہ "حاکم اور محکوم موجود ہوں" قبیلے پر بھی صادق آتی تھی غرض کہ اس گروہ کا مذہب یہ ہے کہ فرد اور سلطنت میں ہرگز تفریق نہیں ہو سکتی۔ اس مذہب کا نام "مذہب عضوی" ہے اس مذہب کے بموجب سلطنت میں زندہ جسم کی طرح لگاتار نمو ہوتا رہتا ہے۔ یہی دائمی نمو، نظام اجتماعی کی ترقی کا باعث حقیقی ہے۔

اس تمثیل سے مقصود یہ نہیں ہے کہ سلطنت ہر اعتبار سے زندہ جسم کے مشابہ ہے۔ کیوں کہ سلطنت کا نمو، اضطراری اور غیر اختیاری نہیں ہے۔ یعنی اس کی ترقی میں افراد کے ارادے کو دخل ہے۔ افراد ہی اپنے ارادے سے اسے ترقی دیتے اور آگے بڑھاتے ہیں۔ برخلاف اس کے حیوانی و نباتی اجسام کے نمو میں اختیار و ارادہ دخل نہیں رکھتا۔ وہ اضطراری و طبعی طور پر موجود ہوتا اور برابر جاری رہتا ہے۔

اس مذہب نے "مذہب استقلال فردی" کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ کیوں کہ آخر الذکر فرد کو سلطنت سے الگ حیثیت دیتا ہے اور حکومت کا اقتدار و اختیار محدود کر کے سلطنت کی ترقی و تقدم روکتا ہے۔ برخلاف اس کے دوسرا مذہب، افراد اور سلطنت کو ایک ہی جسم قرار دیتا ہے اور اس طرح اسے نفع پہنچاتا ہے۔ اس مذہب کی رو سے فرد کو جماعت یا قوم کے فائدے کے لیے شخصی نقصان گوارا کر لینا چاہیے۔ جیسا کہ ہاتھ، سر یا دل کی حفاظت کے لیے اپنا وجود خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔

اگر افراد اس مذہب پر ایمان لے آئیں، تو حاکم کے ان تمام قوانین کی بہ خوشی اطاعت کریں گے، جن سے اگرچہ شخصی طور پر انھیں نقصان پہنچ سکتا ہے مگر وہ جماعت کے لیے مفید ہیں۔ کیوں کہ وہ سمجھیں گے کہ قانون، عام فائدہ کے لیے ہے، نہ کہ شخصی فائدہ کے لیے، اور یہ کہ عام مصلحت کے مقابلے میں شخصی مصلحت فنا ہو جانی چاہیئے۔

لیکن اگر مذہب "استقلال فردی" تسلیم کر لیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ

حاکمانہ قوت کا احترام جاتا رہے گا اور سلطنت کی ترقی رک جائے گی۔ پھر جب سلطنت کمزور ہو جائے گی تو لازمی طور پر فرد بھی کمزور ہو جائے گا۔ کمزور سلطنتوں کی یہی حالت دنیا مشاہدہ کر رہی ہے۔ وہ نہ تو خود خوش نصیب ہیں، نہ ان میں افراد ہی کو خوش نصیبی میسر ہے۔ موجودہ علمائے سیاست کا خیال ہے کہ تاریخ کے تجربے اور روزمرہ کے مشاہدے ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ "مذہب عضوی" قبول کریں اور دنیا میں اس کی اشاعت کریں۔

یہ ناممکن ہے کہ دنیا میں کوئی جماعت ایسی موجود ہو سکے جس کی بنیاد مذہب استقلال فردی پر ہو۔ جماعتوں کی کامیابی و ترقی کے لیے لازمی ہے کہ اس کے تمام افراد، مذہب عضوی کے ماننے والے ہوں، مجموع میں جذب ہو جائیں، اور عموم کی مصلحت کے سامنے اپنی شخصیت بھول جائیں۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے انسانی جماعتیں (سیاسی ہوں یا اجتماعی) ترقی کر سکتی ہیں۔ کوئی انسانی جماعت، انانیت کو اپنا اصول قرار دے کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ کیوں کہ یہ ناممکن ہے کہ تمام افراد کے اغراض اور خواہشیں بالکل متفق و متحد ہو جائیں۔ یہی باعث ہے کہ جن ملکوں میں حکومت سے بے اعتمادی، مذہب انانیت یا استقلال فردی کی طرف عام میلان پیدا کر رہی ہے، وہاں کوئی بھی مشترک عمل کامیاب نہیں ہوتا۔ کتنی ہی انجمنیں قائم ہوتی ہیں، شروع شروع میں بڑا جوش و خروش دکھایا جاتا ہے، لیکن پھر بہت جلد کارکنوں میں پھوٹ پڑ جاتی ہے اور پوری تحریک ختم ہو جاتی ہے۔

مشرق اس بیماری کا بری طرح شکار ہوا ہے۔ اس کی وطنیت و قومیت فنا ہو گئی ہے، عام مصالح ضایع ہو گئے ہیں، اور جماعتی تحریکوں کی کامیابی کی بہت کم مثالیں نظر آتی ہیں۔ مشرق کو یہ مہلک مرض درحقیقت مستبد بادشاہوں کی وجہ سے لاحق ہوا۔ یہ بادشاہ صدیوں تک مشرقی قوموں پر مسلط رہے ہیں، اور اپنے ذاتی اغراض کے لیے جماعتی مصالح برباد کرتے آئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نسلوں کے تجربہ و مشاہدہ کے بعد مشرقی اقوام کے دلوں میں یہ بات جم گئی کہ قومی وحدت بے کار ہے، اور مصلحت عام کے لیے سعی لاحاصل ہے۔ ہوتے ہوتے اب ان کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ وطنیت، قومیت، عام مصلحت، جماعت، وغیرہ الفاظ کے لیے ان کے دلوں میں کوئی کشش پیدا ہی نہیں ہوتی۔ (الہلال: ۱۶ ستمبر ۱۹۲۷ء)

سفیروں کا استقبال

حال میں ایک دلچسپ کتاب جرمنی میں شایع ہوئی ہے: "ازمنۂ وسطیٰ کے شاہی مراسم" اس کے بعض حصوں کا ترجمہ مصری معاصر المقتطف نے شایع کیا ہے۔ ذیل کا ٹکڑا اسی سے ماخوذ ہے:۔

قدیم زمانہ میں سفراء کے استقبال و ملاقات کے لیے دربار بڑی شان و شوکت سے سجائے جاتے تھے۔ بادشاہ اس بارے میں بہت زیادہ اہتمام کا اظہار کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں اگرچہ وہ پرانی شان و شوکت باقی نہیں رہی، تاہم سفراء کی ملاقات و استقبال کے معین اصول و قواعد موجود ہیں، جن کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ ان اصول و قواعد کو بین الاقوامی زبان میں "پروٹوکول" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

(عربی سفرا)

عربی عہد حکومت میں سفراء کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ موجودہ زمانہ کی طرح اس وقت بھی سفیر دو قسم کے ہوتے تھے: عارضی اور دائمی۔ عارضی سفیروں کا کام کسی خاص پیغام کا پہنچانا یا کوئی خاص مہم انجام دینا ہوتا تھا۔ دائمی سفیروں کو دوسری سلطنتوں میں ہمیشہ حاضر رہنا پڑتا تھا۔

صاحب نہایت الادب کی تصریح کے مطابق عربوں نے سفیر کے لیے یہ شرطیں قرار دی تھیں:۔

"خوب صورت ہو۔ اس کا نام خوش گوار ہو۔ متدین اور پارسا ہو مخلص، امین، اور نیک طینت ہو۔ حاضر جواب ہو۔ معاملہ فہم ہو۔ خوشامد کا عادی نہ ہو۔ رشوت قبول نہ کرے۔ ڈرپوک نہ ہو۔"

عرب خلفاء بیرونی سفیروں کی بڑی خاطر مدارات کرتے تھے۔ فاطمی عہد حکومت میں سفیروں کے قیام کے لیے ایک نہایت ہی شاندار محل مخصوص تھا، اور خلفاء کا حکم تھا کہ ان کی زیادہ سے زیادہ عزت کی جائے۔

استقبال کا طریقہ یہ تھا کہ اگر سفیر سپہ سالار کی قسم سے ہوتا، تو اس کے پہنچتے ہی خلیفہ ملاقات کرتا اور پیغام سنتا تھا... اگر فوجی آدمی نہ ہوتا، تو ملاقات سے پہلے تین دن تک مہمان خانہ میں رکھا جاتا تھا۔ اس اثنا میں کوئی شخص بھی اس سے نہیں مل سکتا تھا۔ چوتھے دن خلیفہ کا دربار آراستہ کیا جاتا۔ جنگی افسر رعب وداب سے صفیں باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔ بادشاہ اپنی پوری شان وشوکت سے تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوتا۔ ارکان حکومت اپنے اپنے رتبہ کے مطابق بیٹھتے۔ جب سب انتظام مکمل ہو جاتا، تو صاحب اعظم سفیر کو لیے دربار میں داخل ہوتا۔ جوں ہی خلیفہ کا چہرہ دکھائی دیتا، سفیر فرش زمین کو بوسہ دیتا۔ پھر ادب کے ساتھ آہستہ آہستہ وسط دربار میں پہنچتا، اور وہاں سے مجرا ادا کرنے کے بعد اس مقام پر پہنچایا جاتا، جہاں خلیفہ سے ہم کلامی کر سکتا تھا۔ اس مقام پر پہنچ کر سفیر کھڑا رہتا۔ اس کے گرد شاہی حاجب اور مترجم دست بستہ کھڑے ہوتے۔ خلیفہ جب گفتگو کی اجازت دیتا، تو سفیر مجرا ادا کر کے اپنے بادشاہ کا سلام پہنچاتا۔ خلیفہ اس بادشاہ کے درجہ کے مطابق سلام کا جواب دیتا۔ پھر سفیر اپنی جیب سے بادشاہ کا خط نکال کر اپنی آنکھوں اور سر پر رکھتا اور خلیفہ کے حضور پیش کر دیتا۔ اگر خلیفہ کو اس بادشاہ کی عزت افزائی منظور ہوتی، تو کھڑے ہو کر اس کا خط اٹھاتا تھا۔ پھر وزیروں کو خط کے کھولنے اور پڑھنے کا حکم دیتا تھا۔ تھوڑی دیر معمولی سلام کلام کے بعد سفیر کو بیٹھنے کی اجازت ملتی۔ وہ آداب بجا لا کر اپنی جگہ بیٹھ جاتا۔ دربار کے بعد سفیر مہمان خانہ بھیج دیا جاتا تھا۔ نجی ملاقاتیں بعد میں ہوتی تھیں۔

(فرانس کے شاہی رسوم)

فرانس میں جب شاہی قائم تھی، تو سفیروں سے ملاقات کا طریقہ یہ تھا کہ پیرس میں چند روز قیام کرنے کے بعد وہ وزیر تشریفات سے ملاقات کرتا تھا۔ وزیر اسے بتاتا تھا کہ بادشاہ

کس دن ملاقات کرے گا۔ ملاقات سے تین دن پہلے شاندار شاہی گاڑیاں سفیر کی قیام گاہ پر پہنچتی تھیں، اور اسے مع اس کے مصاحبوں کے سفیروں کی مہمانی کے خاص محل میں لے جاتی تھیں۔ یہاں وہ بادشاہ کا مہمان ہوتا تھا۔ یہ محل نہایت آراستہ ہوتا تھا اور مہمان کی تواضع میں غیر معمولی فیاضی سے کام لیا جاتا تھا۔ روزانہ دعوتیں ہوتی تھیں، اور سفیر کے خوش کرنے کی پوری کوشش کی جاتی تھی۔

سفیر جتنے زیادہ دور ملک کا ہوتا تھا، اتنی ہی زیادہ اس کی خاطر مدارات کی جاتی تھی مورخین کا بیان ہے کہ ترکی سفیر کے صرف کھانے پر شاہ فرانس روزانہ ۵۰۰ اشرفی خرچ کرتا تھا۔ ۱۶۹۹ء میں جب سلطنت مراکش کا سفیر آیا، تو بریسٹ کے قیام کے دوران میں ۹۰۰۰ پونڈ، اور پیرس کے قیام میں ۳۱۷۰۰ پونڈ صرف کیے گیے۔ شہر بریسٹ سے پایۂ تخت تک سفر میں ۳۸۰۰ پونڈ صرف ہوئے تھے۔ یعنی کل ۴۴۵۰۰ پونڈ یا ۶۶۷۵۰۰ روپیہ خرچ کیے گئے تھے۔

اس زمانہ میں دستور تھا کہ سفیر کے دسترخوان کے تماشہ کے لیے پیرس کے عمائدین بلائے جاتے تھے۔ ان کی موجودگی میں سفیر کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ بادشاہ سے ملاقات کے دن سفیر ایک دوسرے محل میں منتقل کیا جاتا۔ یہاں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد شاہی سواریاں اسے لینے آتی تھیں، اور اس کا جلوس دیکھنے کے لیے پیرس کی سڑکوں پر تماشائیوں کا ہجوم ہو جاتا تھا۔

ورسل کے شاہی محل تک پہنچنے میں کامل تین گھنٹے لگتے تھے۔ محل کے پھاٹک اور بیرونی میدان میں سفیر کو صف بستہ فوجیں نظر آتی تھیں۔ ان سے گذر کر وہ سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا محل کے بالائی حصے پر پہنچتا اور اس ایوان میں داخل ہوتا جس میں بادشاہ، ولی عہد اور ارکان سلطنت بڑے جاہ و جلال سے بیٹھے ہوتے تھے۔ شاہی استقبال کے بعد سفیر اپنی تحریر اسناد سناتا تھا۔ اس کے بعد اپنے کاغذات پیش کرتا۔ پھر بادشاہ کے حضور اپنے ساتھیوں اور مصاحبوں کو ایک ایک کر کے پیش کرتا۔ استقبال کا یہ جلسہ بہت دیر تک رہتا تھا۔ پھر سب کھانے کے کمرے میں جاتے تھے اور دعوت شروع ہو جاتی تھی۔ بعض سفیر اس قدر بھڑکیلی اور بھاری وردیاں پہنے ہوتے تھے کہ ان کے بوجھ سے کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ مجبور ہوتے تھے کہ دسترخوان پر بیٹھنے سے پہلے دوسرے کمرے میں جا کر اپنا لباس بدل آئیں۔ دعوت

کے بعد سفیر پھر اپنی سرکاری وردی پہن لیتا اور ولی عہد اور وزراء وغیرہ سے ملاقات کرتا۔ یہ ملاقاتیں بھی اتنی لمبی ہوتی تھیں کہ سفیر تھک جاتا تھا، اور کھانے کے کمرے میں دوبارہ جاکر کچھ کھا پی لیتا تھا۔

لیکن اب یہ طریقے موقوف ہوگئے ہیں۔ آج کل یورپ میں یہ دستور ہے کہ نئے سفیر کے پہنچنے کے بعد دو بجے حاجب سفارت خانہ جاتا ہے۔ سفیر اور اس کا عملہ سرکاری وردیاں پہنے اس کا استقبال کرتے ہیں۔ چند منٹ بعد سرکاری گاڑیاں اور باڈی گارڈ پہنچ جاتا ہے، اور سفیر صدر جمہوریت یا بادشاہ کی ملاقات کے لیے محل کو روانہ ہوجاتا ہے۔ سفیر کے پہنچنے پر جنگی موسیقی کے ذریعہ اسے سلامی دی جاتی ہے۔ جس ملک کا سفیر ہوتا ہے، پہلے اسی ملک کا گانا گایا جاتا ہے۔ پھر قومی گیت بجایا جاتا ہے۔ موسیقی سے فارغ ہوکر سفیر اور اس کے ساتھی گاڑیوں پر سے اترتے ہیں۔ زیریں سیڑھی پر دو فوجی افسر استقبال کرتے ہیں اور سفیر کو مع اس کے ہمراہیوں کے استقبال کے کمرے میں لے جاتے ہیں۔

استقبال کے کمرے میں ایک طرف صدر جمہوریت یا بادشاہ اور ارکان حکومت ہوتے ہیں، دوسری طرف سفیر اور اس کے ساتھی۔ دونوں کے بیچ میں حاجب اور مترجم کھڑے ہوجاتے ہیں۔ حاجب سفیر کا نام اور لقب بیان کرکے اس کا تعارف کراتا ہے۔ پھر سفیر اپنے کاغذات پیش کرتا ہے اور لکھی ہوئی تقریر پڑھ کر سنا دیتا ہے۔ صدر جمہوریت یا بادشاہ جوابی تقریر کرتا ہے۔ پھر رسمی گفتگو ہوتی ہے۔ طرفین کے آدمیوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا جاتا ہے اور مصافحہ پر تقریب ختم ہوجاتی ہے۔

(الہلال: ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۷ء)

"کمیونزم" اور اس کے مقاصد

جرمنی کے کمیونسٹ مرکز اشاعت نے حال میں ایک نیا سلسلۂ مطبوعات "کمیونزم" کے کے اصول ومبادیات پر شایع کرنا شروع کیا ہے جس کی دو جلدیں اس وقت تک شایع ہو چکی ہیں، پہلی جلد میں زیادہ تر مشہور کمیونسٹ رہنما، کارل مارکس کے منتخب مضامین ہیں، اور ابتدا میں اس کی مفصل سوانح حیات بھی شامل کر دی ہے۔

روس کے آخری انقلاب کے بعد سے کمیونزم دنیا کی ایک زندہ اور عامل حقیقت ہو گئی ہے، اور ہر ملک کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ نہ صرف سیاسی حیثیت سے، بلکہ علمی حیثیت سے بھی اس کے اصول ومبادیات کا مطالعہ کرے، اور نقد و بصیرت کے ساتھ صحیح رائے قائم کرے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، اس وقت تک اردو میں کوئی کتاب ایسی شایع نہیں ہوئی ہے جس میں صحت کے ساتھ اس انقلاب انگیز سیاسی واجتماعی مذہب کی حقیقت واضح کی گئی ہو۔ یہ نیا مجموعہ دیکھ کر ہمیں خیال ہوا کہ کارل مارکس کے بعض مختصر مقالات اس غرض کے لیے نہایت مفید اور جامع ہیں۔ ہم ان مقالات میں سے ایک مقالہ الہلال میں شایع کرنے کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف اس مذہب کے اصول و عقائد بلکہ اس کے ظہور واشاعت کی ابتدائی تاریخ بھی واضح ہو جائے گی۔

یہ واضح رہے کہ اس مقالہ اور اسی طرح کے دیگر مقالات کے تراجم سے مقصود صرف یہ ہے کہ وقت کی ضروری معلومات اردو خواں طبقہ کے لیے مہیا ہو جائے۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ یہ خیالات اس حیثیت سے پیش کیے جائیں کہ وہ یک قلم مقبول اور پسندیدہ خیالات ہیں۔ ہمارے خیال میں "کمیونزم" موجودہ تمدن کی سرمایہ دارانہ بے اعتدالی کا قدرتی رد فعل ہے، اور جس طرح موجودہ تمدن کی سرمایہ داری افراط کے ایک انتہائی نقطہ تک

پہنچ چکی ہے، اسی طرح کمیونزم بھی تفریط کے دوسرے نقطہ کا ظہور ہے۔ حق و صواب کی راہ افراط و تفریط کی راہ نہیں ہو سکتی، وہ ہمیشہ درمیان کی راہ ہوتی ہے۔

---

(۱)

(سرمایہ دار اور مزدور)

آج تک کی تمام سوسائٹیوں کی تاریخ، جماعتی کشمکش کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ آزاد اور غلام، شریف اور رذیل، آقا اور خدمت گار، تجارتی مکھیے اور بنجارے، مختصر یہ کہ ظالم اور مظلوم، ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابل کھڑے رہے، اور ایک ایسی مسلسل جنگ میں مشغول رہے جو کبھی علانیہ تھی اور کبھی خفیہ، مگر جس کا خاتمہ ہمیشہ یا تو سوسائٹی کی ایک انقلابی کایا پلٹ کی صورت میں ہوا، یا تمام حریف جماعتوں کی عام بربادی کی شکل میں۔

قدیم ترین تاریخی عہد میں بھی تقریباً ہر جگہ سوسائٹی مختلف درجوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی اور ایک مکمل معاشرتی نظام میں سمٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ قدیم روم میں ہم شریفوں نوابوں، گنواروں، اور غلاموں کی تقسیم پاتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں جاگیردار، اسامی، تجارتی مکھیے، شاگرد پیشہ، اور خدمت گار دکھائی دیتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان میں سے ہر جماعت بھی کئی کئی جماعتوں میں منقسم ملتی ہے۔

موجودہ سرمایہ دار سوسائٹی نے، جس کی تعمیر جاگیردار سوسائٹی کے کھنڈروں پر ہوئی ہے، جماعتی جھگڑے اور رقابتیں موقوف نہیں کیں، بلکہ پہلے سے زیادہ نئے نئے فرقے، ظلم کے نئے نئے طریقے، اور لڑائی کے نئے نئے ڈھنگ نکال لیے ہیں۔

البتہ ہمارے موجودہ سرمایہ دار عہد نے یہ امتیاز ضرور حاصل کیا ہے کہ اس نے جماعتی اختلاف محدود کر دیے ہیں، اور تمام سوسائٹی سمٹ کے دو بڑی حریف جماعتوں: "سرمایہ دار" اور "مزدور" میں تقسیم کر دی ہے۔

قرونِ وسطیٰ کے کاشت کاروں سے دیہاتی نمائندوں کی ابتدا ہوئی اور انھیں اسامیو

نے سرمایہ دار طبقہ کی بھی آب و گل مہیا کی۔

امریکہ کی دریافت اور زمین کے گرد دورے نے اٹھتے ہوئے سرمایہ دار طبقے کے سامنے عمل کا ایک نیا میدان کھول دیا۔ ایسٹ انڈین اور چینی بازاروں، امریکہ کے استعمار، مستعمرانہ تجارت، نیز ذرایع تبادلہ اور ذرایع پیداوار کی وسعت نے تجارت، جہاز رانی، اور صنعت وحرفت میں ایک نئی روح پھونک دی، اور انحطاط پذیر جاگیردار سوسائٹی کے انقلابی عناصر کو تیزی سے ابھار دیا۔

صنعت وحرفت کا سابق جاگیردارانہ نظام وہ بڑھتی ہوئی ضرورتیں پوری نہیں کرسکتا تھا جو نئے بازاروں کے ساتھ پیدا ہو گئیں تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دستکاری کے نظام نے اس کی جگہ لے لی، تجارتی کھیپے معزول ہو گئے، متوسط صنعتی طبقہ ان کا قائم مقام بن گیا۔ مختلف سندی کھیپوں کے مابین محنت کی تقسیم، عام کارخانوں میں محنت کی تقسیم کے آگے معدوم ہو گئی۔

سرمایہ دار طبقہ نے جہاں بھی طاقت حاصل کی، تمام جاگیردارانہ، بزرگانہ، مذہبی، اور معنوی رشتے توڑ پھوڑ ڈالے۔ اس نے بڑی بے رحمی سے وہ تمام بوقلموں بندھن توڑ کے رکھ دیے جو انسان کو اس کے "فطری سرداروں" سے باندھتے چلے آتے تھے اور اس ایک رشتہ کے سوا کوئی رشتہ باہمی روابط کا باقی نہ چھوڑا جسے برہنہ خود غرضی اور کھری نقد ادائیگی کا رشتہ کہتے ہیں۔

اس نے مذہبی انبساط، بہادرانہ جوش، اور متوسط طبقے کی بلند خیالی، خود بیں تخمینہ وشمار کے آب سرد میں غرق کر دی۔ اس نے ذاتی جوہر کو مول تول، اور لین دین کی ایک جنس بنا دیا۔ اور تمام بیش قیمت آزادیوں کو پس پشت ڈال کر "آزاد تجارت"، کی صرف ایک نامعقول آزادی قائم کر دی۔

الغرض اس نے کمزوروں کے اس قدیم خود غرضانہ استحصال کی جگہ جس پر مذہب وسیاست کی دلفریبیوں کا نقاب پڑا ہوا تھا، ایک نیا برہنہ، وحشیانہ، بے شرم، اور کھرا خود غرضانہ استحصال ایجاد کر دیا۔

سرمایہ دار طبقے نے ان تمام پیشوں کی خوبیاں ملیا میٹ کر دیں جو پہلے عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس نے ڈاکٹر، وکیل، پروہت، شاعر، فلسفی، غرضیکہ سب کو محض ایک اجرتی مزدور بنا کے چھوڑ دیا۔

سرمایہ دار طبقہ نے خاندانی رشتے سے محبت و جذبات کے تمام عناصر بھی نکال پھینکے، اور ان کی جگہ ایک خالص مالی لین دین کا رشتہ قائم کر دیا۔

سرمایہ دار طبقہ نے بتا دیا کہ وحشیانہ اظہار طاقت، جسے قرون وسطیٰ کے رجعت پسند اس قدر سراہتے تھے، کاہل سہولت کے ساتھ ان کے عہد میں کس درجہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

یہ طبقہ، سب سے پہلا طبقہ تھا جس نے ثابت کر دکھایا کہ انسان کی سرگرمی کیا کچھ کر سکتی ہے۔ اس نے مصری اہرام، رومن نہروں، اور گوتھک خانقاہوں سے بالکل مختلف قسم کے عجائبات پیدا کیے، اور قدیم ہجرتوں اور مذہبی جہادوں سے بالکل مختلف قسم کی مہمیں جاری کیں۔

تمام سابق صنعتی طبقوں کے وجود کی اولین شرط یہ تھی کہ پیداوار کے اگلے طریقے برقرار رہیں۔ لیکن سرمایہ دار طبقہ کی زندگی ناممکن ہے جب تک کہ آلات پیداوار، طریق پیداوار اور تمام اجتماعی رشتوں میں برابر انقلاب نہ ہوتا رہے۔ چنانچہ طریق پیداوار کا مسلسل انقلاب اجتماعی نظام کی پیہم برہمی، دائمی بے چینی، اور کبھی نہ ختم ہونے والی بے اطمینانی۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو سرمایہ دار عہد کو تمام دیگر زمانوں سے امتیاز دیتی ہیں۔

تمام بجھے تلے اور مضبوط معاشرتی رشتے مع اپنے ہم آہنگ مقرر و محترم عقائد و خیالات کے فنا کر دیے گئے ہیں۔ اور ان کی جگہ جو رشتے اور خیالات رائج کیے گئے ہیں قبل اس کے کہ جمکیں، پرانے ہو چکے ہیں۔ جو کچھ بھی ٹھوس اور مقبول تھا، مٹ چکا ہے۔ جو کچھ بھی مقدس تھا، ناپاک کر دیا گیا ہے۔ اور اب انجام کار انسان مجبور ہو گیا ہے کہ اپنے حالات زندگی اور حقیقی معاشرتی تعلقات، کھلی آنکھوں سے دیکھے۔

تمام کرۂ ارضی کے سرمایہ داروں کو اپنی پیداوار کے لیے ایک برابر بڑھتے رہنے والے

بازار کی ضرورت، دیوانہ کیے ہوئے ہے۔ انھیں ہر جگہ اپنا آشیانہ بنانا، ہر مقام پر ڈیرہ ڈالنا، چپہ چپہ سے ناتا جوڑنا ضروری ہے۔

سرمایہ دار طبقہ نے عالم گیر بازار غصب کر کے تمام ممالک کی درآمد و برآمد قومی اور ملکی قیود سے آزاد کر دی ہے۔ رجعت پسندوں کی امیدوں کے برخلاف صنعت و حرفت کے نیچے سے اس کی بنیادیں نکال کر پھینک دی ہیں۔ قدیم اور مروج صنعتیں برباد کی جاچکی ہیں، اور جو باقی ہیں برابر برباد کی جا رہی ہیں۔ ان کی جگہ نئی صنعتیں رائج کی جا رہی ہیں کہ جن کا رواج تمام مہذب اقوام کے لیے ایک نہایت ہی اہم اور قابل غور مسئلہ ہے، کیوں کہ ان صنعتوں کی حالت یہ ہے کہ صرف یہ اپنے ہی ملک کی خام پیداوار استعمال میں نہیں لاتیں، بلکہ دور دراز علاقوں کی بھی خام پیداوار چاہتی ہیں، نیز ان کی کثرت کی وجہ سے ان کی کھپت صرف ان کے ہی علاقے میں نہیں بلکہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ہونی چاہیئے۔

پرانی ضروریات کی جگہ جو ملکی پیداوار سے رفع ہو جاتی تھیں، نئی ضروریات پیدا ہو گئی ہیں جو اپنے رفع ہونے کے لیے دور دراز ممالک کی پیداوار کا بھی مطالبہ کرتی ہیں۔

یہ حال صرف مادی پیداوار ہی کا نہیں، بلکہ ذہنی پیداوار کا بھی ہے۔ ایک قوم کی دماغی پیداوار، تمام قوموں کی عام ملکیت بن گئی ہے۔ محدود تخئیل اور بے تعلقی روز بروز ناممکن ہوتی جاتی ہے، اور قومی و مقامی ادبیات سے ایک عالمگیر ارضی علم ادب پیدا ہو رہا ہے۔

سرمایہ دار طبقہ، آلات پیداوار کی تیز ترقی اور مواصلات کی مسلسل آسانیوں کے ذریعہ وحشی سے وحشی اقوام کو بھی تہذیب کی طرف کھینچ رہا ہے۔ سامان تجارت کی ارزانی ہی وہ بھاری توپ ہے جس کے زور سے نہایت سرکش قوموں کو بھی اطاعت پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ تمام اقوام کو موت کی دھمکی دی جا رہی ہے کہ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اختیار کر لیں اور نام نہاد تہذیب قبول کر کے مہذب بن جائیں۔

سرمایہ دار طبقہ نے دیہات کو شہر کا تابع بنا دیا ہے۔ بکثرت نئے شہر پیدا کر دیے ہیں۔ دیہات کے مقابلہ میں قصبات کی آبادی میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا ہے۔ اور اس

طرح دنیا کی بہت بڑی آبادی کو دیہاتی زندگی کے سادگیوں سے محروم کر دیا ہے۔

اس نے جس طرح دیہات کو شہر کا محتاج بنایا ہے، ٹھیک اسی طرح وحشی اور نیم وحشی ممالک کو مہذب ممالک کا دست نگر بھی بنا دیا ہے۔ کاشت کار قوموں کو سرمایہ داروں کا اور مشرق کو مغرب کا محتاج بنا دیا ہے۔

سرمایہ دار طبقہ ذرایع پیداوار، ملکیت، اور آبادی کی وسعت پر برابر قابو حاصل کرتا جاتا ہے۔ اس نے آبادی گنجان کر دی ہے۔ ذرایع پیداوار میں مرکزیت پیدا کر دی ہے۔ اور ملکیت کو سمیٹ کر صرف چند ہاتھوں کے اندر محدود کر دیا ہے۔

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ، سیاسی مرکزیت تھی جو سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھوں وجود میں آ چکی ہے، آزاد اور نیم آزاد اقوام جن کے مصالح، قوانین، حکومت، اور رسم و رواج جدا جدا تھے۔ کھینچ تان کے ایک قوم بنا دی گئی ہیں، ایسی قوم جس کی حکومت، ضابطۂ قانون، اجتماعی مصالح، اور رسم و رواج، سب ایک ہیں۔

سرمایہ دار طبقہ نے اپنے صد سالہ جماعتی عہد حکومت میں ایسی عظیم الشان بار آور قوتیں پیدا کر دی ہیں جنھیں تمام پچھلی نسلیں بھی پیدا نہ کر سکی تھیں۔ اس نے قدرت کی طاقتوں پر قبضہ کیا، علم آلات اور کیمیا کا صنعت و زراعت میں استعمال کیا، دخانی جہاز، ریلوے، اور تار برقی کے سلسلے جاری کیے، زراعت کے لیے تمام براعظموں کی صفائی کی، دریاؤں کی نہر بندی کی، اور زمین کے تمام خزانے الٹ ڈالے۔ بھلا کسی پچھلی نسل کو یہ وہم بھی گزرا تھا کہ اجتماعی محنت کی گود میں ایسی بار آور قوتیں پڑی سو رہی ہیں؟

گزشتہ بیان میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ ذرایع پیداوار اور تبادلہ جن کی بنیادوں پر سرمایہ دار طبقہ نے اپنی عمارت کھڑی کی ہے، اگرچہ جاگیرداری کے عہد میں پیدا ہوئے تھے مگر خود جاگیر ان سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکی بلکہ الٹے ان کے گرداب میں پڑ کر تباہ ہو گئی، کیوں کہ یہ ذرایع پیداوار اور تبادلہ جب اپنی ترقی کی ایک خاص منزل پر پہنچ گئے، تو وہ حالات جن کے ماتحت جاگیردار سوسائٹی پیدا کرتے اور تبادلہ کرتے تھے، یعنی کاشت کاری و دست کاری کا جاگیردارانہ نظام، ترقی یافتہ قوتوں کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔ وہ پیداوار کو

سہارا دینے کے بجائے اس کے حق میں روک اور بوجھل بیڑیاں بن گئے، جن کا ٹوٹ کر گرنا ضروری تھا، چنانچہ ان کی جگہ آزاد مقابلے اور سرمایہ دار طبقہ کی اقتصادی وسیاسی حکومت نے لے لی۔

لیکن اب تاریخ نے اپنا اعادہ پھر شروع کیا ہے، جو کچھ جاگیر داروں پر گزرا ہے، وہی اب سرمایہ داروں کو درپیش ہے۔

سرمایہ دارانہ حالات، پیداوار، تبادلہ، سرمایہ دارانہ املاک کے رشتے، غرضیکہ پوری موجودہ سرمایہ دار سوسائٹی جس نے ایسے عظیم الشان ذرایع ایجاد کیے ہیں، سخت مصائب میں مبتلا ہے۔ اس کی مثال اس جادوگر کی سی ہے جو خبیث طاقتوں کو جگا تو دیتا ہے مگر ان پر قابو نہیں رکھ سکتا۔

بہت زمانہ تک صنعت وتجارت کی تاریخ، جدید بار آور قوتوں کی موجودہ حالات کے خلاف، ایک بغاوت کی عام تاریخ رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ان تجارتی مشکلات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا جو وقتاً فوقتاً پوری سرمایہ دار سوسائٹی کے لیے موت وحیات کا سوال پیدا کر دیا کرتی ہیں۔

لیکن باوجود ان خوفناک خطروں کے ایک عام اجتماعی وبا پھیلی ہوئی ہے جس کا نام "زائد پیداوار" ہے اور جو پچھلے زمانوں میں یقیناً ایک حماقت معلوم ہوتی۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ سوسائٹی اپنے تئیں اچانک ایک عارضی وحشیانہ حالت میں مبتلا پاتی ہے۔ قحط اور بربادی کی ایک عالمگیر جنگ برپا ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صنعت و تجارت اور زندگی کے تمام ذرایع تباہ ہو جائیں گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ تہذیب بہت زیادہ ہو گئی ہے، ذرایع زندگی بہت زیادہ ہو گئے ہیں، صنعت بہت زیادہ ہو گئی ہے، تجارت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔

ان خطرات کا مقابلہ سرمایہ دار کیوں کر کرتے ہیں؟ اس طرح کہ ایک طرف تو بہت سی بار آور قوتیں بجبر برباد کر ڈالتے ہیں، دوسری طرف نئے بازاروں کو فتح کرتے اور پرانے بازاروں کو مزید رونق دیتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اور بھی

زیادہ وسیع اور زیادہ برباد کن مشکلات کے لیے راستہ ہموار کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ وہ ذرایع بھی مٹائے جاتے ہیں جن سے یہ مشکلات رفع کی جا سکتی تھیں۔

غرض کہ وہ ہتھیار جن سے سرمایہ داروں نے جاگیر داری پر فتح حاصل کی تھی، اب خود انھیں پر الٹ پڑے ہیں۔

لیکن سرمایہ داروں نے صرف یہ مہلک ہتھیار ہی نہیں گڑھے ہیں، بلکہ وہ لوگ بھی پیدا کر دیے ہیں جو یہ ہتھیار استعمال کریں گے۔ وہ کون ہیں؟ موجودہ مزدور۔

جس تناسب سے سرمایہ اور سرمایہ داروں نے ترقی کی ہے، اسی تناسب سے مزدوروں نے بھی ترقی کی ہے۔ اس طبقہ کی زندگی اسی وقت تک ہے جب تک اسے کام ملتا رہے۔ اور کام اسی وقت تک ملتا ہے جب تک وہ سرمایہ کو بڑھاتا رہے۔ یہ مزدور جو اپنے تئیں فرداً فرداً بیچ ڈالنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں، تجارت کی دوسری چیزوں کی طرح ایک جنس ہو گئے ہیں اور مقابلہ کے ہیر پھیر اور نرخ کے چڑھاؤ اتار سے ہمیشہ مصیبت جھیلتے رہتے ہیں۔

مزدور کا کام، کلوں کے کثرت استعمال اور محنت کی تقسیم کے باعث اپنی انفرادی شخصیت سے محروم ہو گیا ہے اور اب مزدور کے لیے اپنے اندر کوئی خاص کشش نہیں رکھتا۔ مزدور مشین کا محض ایک ضمیمہ بنا دیا گیا ہے، جس سے نہایت آسان کام کی خواہش کی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اس کی قیمت گھٹ کر بس اتنی ہی رہ گئی ہے کہ مزدور بہ مشکل اس سے اپنی قوت لایموت کا سامان کر سکتا ہے۔

اب ایک مصنوعی برتن اور مزدور، دونوں ہم درجہ چیزیں ہو گئی ہیں جن کی قیمت ان کی لاگت کے حساب سے ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جوں جوں محنت سستی ہوتی جاتی ہے، مزدوری بھی گھٹ رہی ہے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ جس قدر کام کی تقسیم اور کلوں کا استعمال بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر کام کا بوجھ بھی بڑھ رہا ہے، یا تو کام کے گھنٹے بڑھا دیے جاتے ہیں، یا زیادہ کام ایک خاص وقت میں لیا جاتا ہے، یا مشین کی رفتار میں اضافہ کر دیا جاتا ہے، (وغیرہ وغیرہ)

موجودہ صنعت نے تیک آقا کی چھوٹی سی دکان کو صنعتی سرمایہ دار کے بڑے کارخانہ کی صورت میں بدل دیا ہے۔ مزدوروں کے غول کارخانوں میں بھرے ہوئے ہیں جن کی تنظیم سپاہیوں کی طرح کی جاتی ہے، اور جو سپاہیوں ہی کی طرح چھوٹے بڑے افسروں کی ایک مطلق العنان حکومت کے شکنجہ میں جکڑ دیے گئے ہیں۔ وہ نہ صرف سرمایہ دار طبقے اور سرمایہ دار حکومت کے غلام ہوتے ہیں، بلکہ انھیں شب و روز ہر سرمایہ دار صناع کی بھی غلامی کرنی پڑتی ہے۔

جس قدر کھلے الفاظ میں یہ خودسر حکومت اعلان کرتی جاتی ہے کہ خود غرضی اور منفعت شخصی اس کا مقصد ہے، اسی قدر وہ حقیر، نفرت انگیز، اور تکلیف دہ ہوتی جاتی ہے۔

دستی مشقت میں قوت اور چستی کی ضرورت جتنی کم ہوتی جاتی ہے، یعنی موجودہ صنعت جس قدر زیادہ ترقی کرتی جاتی ہے، اسی قدر مردانہ محنت کی جگہ زنانہ محنت کو دی جا رہی ہے۔ مزدوری پیشہ طبقہ کے لیے اب عمر اور جنس کا اختلاف کوئی معاشرتی اہمیت نہیں رکھتا۔ مزدور مرد اور عورتیں سب کے سب محنت کے پرزے ہو گئے ہیں۔ جن کی قیمت عمر اور جنس کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

جوں ہی مزدور کو اپنے سرمایہ دار آقا سے مزدوری ملتی ہے، فوراً دوسری سرمایہ دار جماعتیں اس پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ مکان دار، دوکان دار، ساہوکار، غرض کہ سب کے سب اس کے لوٹنے کھسوٹنے کو آموجود ہوتے ہیں۔

ادنیٰ اور متوسط طبقہ، چھوٹے دوکاندار، سوداگر، زراعت پیشہ، زمیندار، دست کار، سب کے سب مزدوری پیشہ طبقہ میں جذب ہو رہے ہیں۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ ان کا معمولی سرمایہ موجودہ صنایع کے لیے ناکافی ہے اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کے مقابلہ میں بے کار ہو جاتا ہے، اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کے خاص پیشوں کو پیداوار کے نئے ذرایع نے ظاہر ہو کر بے قدر کر دیا ہے۔ اس طرح مزدوروں کا یہ طبقہ صرف مزدوروں ہی سے نہیں بلکہ آبادی کے ہر حصہ سے مرکب ہے۔

مزدوری پیشہ طبقہ مختلف تدریجی مرحلوں سے گذر کر اس درجہ تک پہنچا ہے۔ سرمایہ دار کے برخلاف اس کی جدوجہد اس کی پیدائش کے وقت ہی سے شروع ہو گئی ہے۔

سب سے پہلے یہ جدوجہد ایک فرد واحد مزدور کی جدوجہد کی حیثیت سے شروع ہوئی، پھر کسی ایک کارخانہ کے مزدوروں کی جدوجہد بنی، پھر کسی خاص نواح کے ہم پیشہ تمام مزدوروں کی جدوجہد کی صورت میں تبدیل ہو گئی، جس کا مقصد سرمایہ داروں سے جنگ کرنا تھا جو ان سب کو براہ راست تباہ کر رہا تھا۔

اس منزل میں مزدور، سرمایہ دارانہ طریق پیداوار پر نہیں بلکہ خود آلات پیداوار پر حملہ کرتے تھے، بیرونی مال برباد کر ڈالتے تھے، مشینیں توڑ پھوڑ ڈالتے تھے، کارخانوں میں آگ لگا دیتے تھے، اور کوشش کرتے تھے کہ طاقت کے زور سے اپنی وہ حیثیت پھر قائم کر دیں جو قرون وسطیٰ میں ضایع ہو چکی تھی۔ لیکن باوجود متحدہ مقصد رکھنے کے، اس منزل میں، مزدور ایک غیر متحد بھیڑ کی شکل رکھتے تھے جو تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی، اور جس کے اندر باہمی مقابلہ کے جذبہ نے پھوٹ ڈال دی تھی۔

اس دور میں مزدور جب منظم ہونے کے لیے متحد ہوئے، تو یہ ان کے اپنے اتحاد کا نہیں، بلکہ سرمایہ دار طبقہ کے اتحاد کا نتیجہ تھا۔ وہ اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے مجبور ہو جاتا تھا کہ مزدوروں میں ایک نئی حرکت پیدا کر دے۔

اس منزل میں مزدور براہ راست اپنے دشمنوں سے نہیں لڑتے تھے، بلکہ ان کی جنگ اپنے دشمن کے دشمنوں سے ہوتی تھی، یعنی مطلق العنان شاہی سے، زمینداروں سے، غیر صنعتی اور چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں سے۔

اس طرح مزدوروں کی یہ پوری تاریخی تحریک، سرمایہ دار طبقہ ہی کے ہاتھوں میں رہی ہے، اور تمام کامیابیاں جو اسے حاصل ہوتی ہیں، سرمایہ داروں ہی کی کامیابیاں ہیں۔

صنعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ مزدوری پیشہ طبقہ کی کمیت میں صرف افراد ہی

کا اضافہ نہیں ہوا، بلکہ بڑی بڑی جماعتیں بھی اس میں شامل ہوتی گئیں اور اب تک ہو رہی ہیں۔

اس کی طاقت روز بروز بڑھ رہی ہے اور وہ اپنی طاقت کی افزونی برابر محسوس کر رہا ہے۔

جوں جوں مشینری، محنت کے امتیازات مٹاتی جاتی ہے اور اجرت ہر جگہ کم سے کم کرتی جاتی ہے، اسی قدر مزدوروں کے فوائد اور حالات زندگی میں بھی یکسانیت پیدا ہو رہی ہے۔

سرمایہ دار طبقہ میں مقابلہ کی روح جس قدر ترقی کرتی جاتی ہے اور تجارتی مشکلات جس قدر بڑھتی جاتی ہیں، اسی قدر مزدوروں کی اجرت میں اتار چڑھاؤ زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ مشینری کی مسلسل اور تیز ترقی مزدوروں کی روزی کو برابر غیر محفوظ بنا رہی ہے، اور انفرادی مزدور اور انفرادی سرمایہ دار کا شخصی تصادم، جماعتی تصادم کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے ایک طرف مزدور، سرمایہ داروں کے خلاف متحد ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف سرمایہ دار شرح اجرت برقرار رکھنے کے لیے مزدوروں کے برخلاف جتھابندی کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے تئیں مستقل انجمنوں کی صورت میں منظم کر لیا ہے۔ تاکہ اچانک تصادم کے لیے پہلے سے تیار رہیں۔ کہیں کہیں یہ باہمی لڑائی بغاوت کی صورت میں بھی پھوٹ چکی ہے۔

کبھی کبھی مزدوروں کو فتح حاصل ہو جاتی ہے، مگر محض تھوڑی مدت کے لیے۔ اس سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہیئے۔ کیوں کہ ان کی جد وجہد کا اصلی ثمرہ فوری کامیابی نہیں بلکہ ان کے بڑھتے ہوئے اتحاد میں ہے۔ اس اتحاد کو موجودہ ذرایع آمد و رفت سے جو موجودہ صنعت کی ایجاد ہیں، بہت مدد مل رہی ہے۔ مختلف ممالک کے مزدور باہم دگر مل رہے ہیں، اور اس طرح وہ کام انجام پا رہا ہے جس کی از حد ضرورت تھی۔ وہ اتحاد جس کے حصول میں قرون وسطیٰ کے شہریوں کو اپنی خراب سڑکوں کی وجہ سے صدیاں لگ جاتیں موجودہ مزدوروں کو ریلوے کے ذریعہ چند سالوں کے اندر حاصل ہو گیا ہے۔

مزدوروں کی جماعتی اور سیاسی تنظیم خود ان کے باہمی مقابلہ کی وجہ سے ہمیشہ

رک رک جایا کی ہے، لیکن ہر مرتبہ زیادہ قوت، زیادہ استقلال، اور زیادہ استحکام کے ساتھ ابھری ہے۔ سرمایہ داروں کی باہمی پھوٹ سے اسے کافی فائدہ پہنچا ہے، اور وہ ہر موقعہ پر مزدوروں کے حقوق و مفاد کے قانونی اعتراف پر مجبور ہو گئے ہیں۔

قدیم سوسائٹی میں جماعتوں کا باہمی تصادم، مختلف طریقوں سے مزدوری پیشہ طبقہ کو بڑھا رہا ہے۔ خود سرمایہ دار بھی مجبوراً اس کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ وہ اپنے تئیں ایک مسلسل حالت جنگ میں پاتے ہیں۔ ایک طرف خاندانی امارت ہے، دوسری طرف خود سرمایہ داروں کی وہ جماعتیں ہیں جن کے مفاد صنعتی ترقی کے منافی ہیں۔ تیسری طرف بیرونی ممالک کے سرمایہ دار ہیں جو ہر وقت لوٹ پڑنے کے لیے تیار ہیں۔ غرضکہ سرمایہ داروں کو ہر طرف لڑنا اور ہر ایک سے نبرد آزمائی کرنی پڑتی ہے، ظاہر ہے وہ تن تنہا اتنے دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اور مجبور ہوتے ہیں کہ مزدوروں سے اعانت کی اپیل کریں۔ اس طرح وہ خود ہی مزدوروں کو سیاسی اکھاڑہ میں کھینچ لاتے ہیں، اور ان کے لیے اجتماعی تعلیم کے عناصر مہیا کر دیتے ہیں۔ وہ خود ہی مزدوروں کے ہاتھ میں وہ ہتھیار دیدیتے ہیں جو خود ان کے خلاف استعمال کیے جائیں گے۔

صرف یہی نہیں بلکہ صنعت کی ترقی نے حکمراں طبقہ کے تمام حصوں کو بھی عجلت اور گھبراہٹ کے ساتھ مزدوری پیشہ طبقہ کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا ہے، یا کم از کم ان کی زندگی خطرہ میں ڈال دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حکمراں جماعت مزدوری پیشہ طبقہ کے لیے ترقی کے بے شمار پرزے مہیا کر رہی ہے۔

جس طرح پچھلے زمانہ میں شرفار کا ایک حصہ سرمایہ داروں میں آملا تھا، اسی طرح اب سرمایہ داروں کا ایک حصہ مزدوروں میں آرہا ہے، خصوصاً وہ مفکر حصہ جسے اس تاریخی تحریک کا نظری علم حاصل ہو گیا ہے۔

تمام جماعتیں جو فی الحال سرمایہ دار طبقہ سے برسرجنگ ہیں، ان میں صرف مزدوری پیشہ جماعت ہی ایک حقیقی انقلابی جماعت ہے۔ باقی تمام دوسری جماعتیں موجودہ صنعت کے سامنے سڑتی اور گلتی چلی جاتی ہیں۔ اور یہ کچھ عجیب نہیں، کیوں کہ مزدوری

پیشہ طبقہ ہی صنعت و حرفت کی خاص اور براہ راست پیداوار ہے۔

رہا ادنیٰ اور متوسط طبقہ، چھوٹے چھوٹے دست کار، معمولی دوکاندار، زراعت پیشہ زمیندار، تو یہ سب سرمایہ دار طبقہ سے اس لیے جنگ کر رہے ہیں کہ متوسط طبقہ کے رکن ہونے کے لحاظ سے اپنی حیثیت برقرار رکھیں۔ یہ جماعتیں انقلابی نہیں بلکہ قدامت پسند ہیں۔ قدامت پسند ہی نہیں بلکہ رجعت پسند بھی ہیں۔ وہ تاریخ کا چکر لوٹا کر الٹا چلانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اگر وہ کبھی انقلابی ہو بھی گئیں، تو صرف اس خوف سے ہوں گی کہ مبادا مزدوری پیشہ طبقہ میں جبراً دھکیل نہ دی جائیں۔

گزشتہ سوسائٹی کے معاشرتی حالات اب مزدوروں کے معاشرتی حالات میں مدغم ہو چکے ہیں۔ مزدوری پیشہ طبقہ بغیر کسی ملکیت کے ہے، اس کے اپنے بیوی بچوں سے رشتے سرمایہ دارانہ خاندانی رشتوں سے بالکل مختلف ہیں۔ موجودہ صنعتی محنت اور سرمایہ داری نے انگلینڈ، فرانس، امریکہ، اور جرمنی میں مزدوروں کے تمام قومی اخلاق خراب کر ڈالے ہیں۔ مزدوروں کے حق میں قانون، اخلاق، مذہب، ٹٹیاں ہیں جن کے پیچھے بیٹھ کر سرمایہ دار انھیں شکار کیا کرتے ہیں۔

تمام گذشتہ جماعتوں نے طاقت پا کر ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ اپنی حیثیت مضبوط کرنے کے لیے تمام سوسائٹی کو اپنے ہی طریق عمل کا پابند کر دیں۔ مزدوروں کو بھی اسی اصول پر عمل کرنا چاہیے۔ وہ سوسائٹی کی بار آور قوتوں پر قابو حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ اس کے تمام پرانے دستوروں کو منسوخ نہ کر دیں۔ خود مزدوروں کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس کی انھیں حفاظت کرنی ضروری ہو۔ انھیں شخصی ملکیت کی تمام سابق پابندیاں اور ضمانتیں منسوخ کر دینی چاہئیں۔

تمام پچھلی تاریخی تحریکیں یا تو آبادی کی اقلیت کی تحریکیں تھیں، یا ان کے مفاد کے لیے تھیں۔ لیکن مزدوروں کی تحریک بالکل دوسری ہی نوعیت کی ہے۔ وہ عظیم الشان اکثریت کی ایک حساس تحریک ہے اور عظیم الشان اکثریت کے مفاد کے لیے ہے۔

مزدوری پیشہ طبقہ، موجودہ سوسائٹی کی سب سے نچلی پرت ہے۔ وہ اس وقت

نہیں اٹھ سکتا ہے، جب تک کہ اوپر کے وہ تمام پرت جن سے حاکمانہ سوسائٹی مرکب ہے، پرزے پرزے کر کے اڑا نہ دیے جائیں۔

اگرچہ مزدوروں کا قیام قومی بنیادوں پر نہیں ہے، لیکن سرمایہ داروں کے برخلاف ان کی جد وجہد ضرور قومی ہے۔ ہر ملک کے مزدوروں کو قدرتی طور پر سب سے پہلے اپنے یہاں کے سرمایہ داروں سے نبٹ لینا چاہیے۔

(الہلال: ۴ نومبر ۱۹۲۶ء)

نپولین
اور اس کی اخلاقی زندگی

(قسط اوّل)

انسان ذہن وجسم کی کتنی ہی عظمتیں حاصل کرلے، لیکن روح اور اخلاق کی ادنیٰ سے ادنیٰ پاکیزگی بھی حاصل نہیں کرسکتا، اگر اس کا اعتقاد اور عمل روحانی ہدایت کی روشنی سے محروم ہے۔

انسان کے لیے یہ سہل ہے کہ تمام دنیا فتح کرلے۔ سکندر نے دنیا کی تمام سلطنتیں تہ و بالا کر ڈالی تھیں۔ انسان کے لیے یہ بھی دشوار نہیں کہ ذہن وفکر کی ایسی بلندیوں تک پہنچ جائے جہاں تک دوسروں کے قدم نہ پہنچ سکے ہوں۔ ارسطو، اقلیدس، سولن، اور سنیکا جیسے فاتحین علم کی فتح مندیاں لازوال ہوچکی ہیں، اور دنیا منطق، ریاضی، قانون، اور فلسفۂ اخلاق میں آج تک ان کی پیرو ہے۔ انسان کی اولوالعزمی ان بلندیوں پر بھی نہیں رکتی۔ کچھ مشکل نہیں اگر وہ آگ کے شعلوں میں کود پڑے، سمندر کی موجوں کی ہنسی اڑائے، پہاڑوں کی صفیں چیر ڈالے۔ لیکن ہاں، یہ مشکل ہے، بہت ہی مشکل ہے، کہ وہ اخلاق اور روحانی پاکیزگی کی راہ میں اپنی کسی ایک خواہش نفس کا بھی مقابلہ کرسکے۔ اس کی ساری اولوالعزمی اور کوہ ہمتی جو دنیا کی ساری رکاوٹوں کا تن تنہا مقابلہ کرسکتی ہے، ہوائے نفس کی ایک ادنیٰ سی رکاوٹ بھی اپنی راہ سے ہٹا دینے پر قادر نہیں ہوتی۔ سکندر تمام دنیا کی تسخیر کی محنت سے نہیں تھکا، لیکن بابل کی ایک عورت جب اس کے سامنے آئی تو اپنی خواہش نفس کے اضطراب سے بے بس ہوکر گر گیا۔ سنیکا نے تمام نوع انسانی کو اخلاق اور اخلاقی سعادت کی دعوت دی، لیکن خود اپنے آپ کو ایک دوسرے انسان کی منکوحہ عورت سے باز نہ رکھ سکا۔ ارسطو کے دامن علم کے دھبے بھی دنیا گن چکی ہے۔ اور یونان کی ایک قدیم ضرب المثل

ہمیں بتلاتی ہے۔ "بڑا انسان بنو۔ اگر نیک انسان نہیں بن سکتے۔"

فی الحقیقت انسانی زندگی کی یہی اخلاقی اور عملی نامرادی ہے، جو الہامی ہدایت کی کسی بالاتر قوت کی ضرورت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ انسان اپنے ذہن و جسم کی قوتوں سے سب کچھ کر سکتا ہے، لیکن تکلف اور بناوٹ سے بھی اپنے آپ کو نیک نہیں بنا سکتا۔ اگر انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس عملی صداقت کی کچھ بھی ضرورت ہے جسے نیکی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو ناگزیر ہے کہ عام انسانی سطح سے کوئی بلند تر ذریعہ ارشاد و ہدایت کا ہو۔ مذہب اور الہام اسی ذریعہ ہدایت کا نام ہے۔

(نپولین اعظم)

اٹھارہویں صدی میں نپولین بوناپارٹ کا ظہور بھی انسانی اولوالعزمی کا ایک عظیم ظہور تھا۔ شاید ہی یورپ کے کسی انسان کی نسبت دنیا نے اس قدر کہا اور سنا ہو، جس قدر اس غیر معمولی انسان کی عجیب و غریب دماغی قوتوں کی نسبت کہہ سن چکی ہے۔ تاہم انسانی عظمت کی اخلاقی نامرادی کا یہ کیسا عبرت انگیز منظر ہے کہ یہی نپولین جب میدان جنگ سے باہر اپنے گھر کی محفوظ زندگی میں دیکھا جاتا ہے، تو اس میں اتنی قدرت بھی نظر نہیں آتی کہ نہایت ادنیٰ درجے کی اخلاقی کمزوریوں سے اپنے آپ کو باز رکھے۔

حال میں جرمنی کے ایک اہل قلم گیرٹرڈ اریٹز (Gertrude Aretez) نے ایک کتاب "نپولین اور اس کی دوست عورتیں" لکھی ہے، اور اس میں مستند تاریخی ذرائع سے وہ تمام شہادتیں جمع کر دی ہیں جو نپولین کی عاشقانہ بوالہوسیوں سے تعلق رکھتی ہیں اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی شایع ہو گیا ہے، اور دو تین ہفتہ سے انگلستان اور یورپ کے اکثر اخبارات و رسائل کا موضوع بحث ہے۔ ہم اس کی بعض تاریخی داستانیں قارئین الہلال کی عبرت و بصیرت کے لیے درج کرتے ہیں۔

(سولہ برس کی عمر میں عشق)

محبت کے باب میں نپولین کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ "محبت کاہل آدمی کا دل بہلاوا ہے۔" ممکن ہے، نپولین نے یہ اس وقت کہا ہو، جب وہ پاک دامن تھا۔ لیکن بعد میں ___ اگر مخالف مورخین کی روایت تسلیم کر لی جائے تو ___ اس نے اس قول کی بنا پر حسن و ہوس کی زندگی سے اجتناب نہیں کیا، وہ ہمیشہ کسی نہ کسی حسینہ سے وابستہ رہا۔

آغاز شباب میں نپولین مارسیلز اور پیرس کی سڑکوں پر پھٹے پرانے کپڑے پہنے پھرا کرتا تھا۔ نہ تو اس کی ہیئت سے کسی کو دولتمندی کا شبہ ہو سکتا تھا، نہ اس میں ظاہری حسن و جمال ہی کچھ ایسا غیر معمولی تھا کہ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرے تاہم یہ واقعہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی بہ کثرت عورتیں اس پر عاشق ہو گئی تھیں۔ کیوں کہ فی الواقع اس میں کوئی ایسی نامعلوم کشش موجود تھی، جو دلوں کو لبھا لیتی تھی۔ ممکن ہے، اس کا شرمگیں انداز اور اس کے پرغور چہرہ کی عجیب اداسی اس کے دیکھنے والوں کے دلوں میں محبت پیدا کر دیتی ہو۔

کہا جاتا ہے کہ نپولین سولہ برس کی عمر میں جب والنسا میں رہتا تھا، تو وہاں کی بہت سی حسین عورتیں اس پر فریفتہ ہو گئی تھیں۔ مگر خود اسے بجز ایک کے کسی سے دلچسپی نہیں ہوئی۔ اس دوشیزہ کا نام "کارولین کولومبیا" تھا۔ وہ نہایت نازک اندام اور خوب صورت تھی۔ ایک مرتبہ خود نپولین نے اس لڑکی کے متعلق کہا تھا:

"اس وقت دنیا میں کوئی دو شخص ایسے خوش نصیب نہ تھے جیسے ہم دونوں تھے۔ ہم ایک ایسی پاک محبت کے مزے لوٹ رہے تھے، جیسی خواب میں بھی کسی انسان نے نہ دیکھی ہوگی.... اکثر ہم دونوں باغوں میں چلے جاتے تھے اور درختوں پر چڑھتے اترتے۔ بارہا ہم دن دن بھر مخلوق کی نظروں اور شہر کے شور و غل سے دور بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے!"

لیکن امتداد زمانہ نے نپولین کے دل سے اس دوشیزہ کی یاد محو کر دی اور اسے اپنی ایک ہم وطن لڑکی سے عشق ہو گیا۔ نپولین شروع ہی سے مستبد تھا۔ اس نے اپنی محبوبہ کو سختی سے حکم دے دیا کہ اس کے سوا کسی کو بھی مسکرا کر نہ دیکھے۔ لڑکی کے دل میں اس جابرانہ حکم سے نفرت پیدا ہو گئی، اور اس کے پنجہ سے نکلنے کے لیے اس نے ایک دن شراب میں زہر ملا دیا۔ اور نپولین مرتے مرتے بچا!

(ادھیڑ عورت سے عشق)

اس واقعہ سے کچھ عرصہ بعد نپولین کو ایک ادھیڑ عورت "میڈم پرمون" سے محبت ہو گئی، اور اس قدر بڑھی کہ ایک لمحہ بھی اس کی جدائی گوارا نہ تھی۔ ایک دن نپولین نے اس سے باضابطہ شادی کر لینے کی درخواست کی۔ عورت نے اس خواہش پر زور سے قہقہہ لگایا۔ "تم بے وقوف ہو گئے ہو! مضحکہ بننا چاہتے ہو! بھلا لوگ کیا کہیں گے؟ بیوی ہونے کے بجائے میں تمہاری ماں بننے کے زیادہ قابل ہوں"۔ نپولین پر یہ بات بہت ناگوار گزری اور قطع تعلق کر لیا۔

(نپولین کا طریق محبت)

ایک مورخ کا بیان ہے کہ نپولین نے بے شمار عورتوں کا دل توڑا ہے۔ اس کی عادت تھی کہ تعلقات بڑھائے جاتا تھا، اور جب عورت اس کے دام محبت میں پھنس جاتی تھی، تو بے اعتنائی سے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ "میڈم ولسکا" پولینڈ کی ایک حسینہ کا واقعہ اس بات کا کافی ثبوت ہے نپولین نے اس عورت کو دیکھا اور لبھانا چاہا۔ مگر اس نے سخت نفرت کا اظہار کیا۔ نپولین نے اسے قبضہ میں لانے کی بہت کوشش کی، مگر وہ برابر بے زار رہی۔ آخر ایک دن غضبناک ہو کر چلایا۔

"تو دیکھے گی۔ میں تجھے کس طرح زیر کرتا ہوں۔ تجھے میرے ارادہ کے سامنے جھکنا پڑے گا! دیکھ یہ میرے ہاتھ میں گھڑی ہے، جس طرح میں یہ گھڑی چور چور کیے ڈالتا ہوں، اسی طرح پولینڈ کا ملک بھی پاش پاش کر کے پھینک دوں گا!"

اس نے یہ کہا اور گھڑی زور سے دیوار پر مار دی۔ اس حرکت کا عورت پر اتنا شدید اثر ہوا کہ وہ بے ہوش ہو کر نپولین کے قدموں پر گر پڑی۔

لیکن چند دنوں بعد ہی نپولین نے اسے اکتا کر چھوڑ دیا۔

(محبت میں استبداد)

عشق و محبت کے میدان میں بھی اس شخص کے ظلم و استبداد کے قصے مشہور ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ غربت کے زمانہ میں جب نپولین اور اس کا بھائی مارسیلز کے بازاروں میں پھرا کرتے تھے، اتفاق سے ریشم کا ایک سوداگر "فرانسوا کلاری" کے خاندان سے ان کا تعارف ہو گیا۔ اس

تاجر کی دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی کا نام "جولیا" تھا چھوٹی کا "ڈیزیرا"۔ نپولین نے شروع میں جولیا کو پسند کیا اور اس کے بھائی نے ڈیزیرا کو۔ تھوڑے دن بعد نپولین اپنی محبوبہ سے سیر ہوگیا، اور بھائی کی محبوبہ پر قبضہ جمانا چاہا۔ چنانچہ ایک موقعہ پر جب یہ چاروں عاشق و معشوق جمع تھے، نپولین نے حکیمانہ انداز میں کہا "جوزف! تم اور تمہاری محبوبہ دونوں غیر مستقل مزاج ہیں۔ لیکن مجھ میں اور میری محبوبہ میں استقلال ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم تم مبادلہ کرلیں تاکہ تمہارا نقص جولیا پورا کردے، اور میں ڈیزیرا کی کمی پوری کردوں۔" یہ عجیب و غریب فلسفہ بیان کرکے اس نے اپنے بھائی کی محبوبہ کو اپنے پہلو میں بٹھالیا اور کسی کو بھی مخالفت کی جرأت نہ ہوئی!

لیکن تھوڑے ہی زمانہ کے بعد نپولین نے محسوس کیا کہ عزت و عظمت کی راہیں اس کے سامنے کھلی ہوئی ہیں۔ لہٰذا ڈیزیرا کو یک قلم چھوڑ دیا، اور اس کی منتوں اور آنسوؤں کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔

(جوزیفائن سے عشق)

اس کی طبیعت کچھ ایسی بے چین واقع ہوئی تھی کہ ایک ہی حالت پر چلے جانا اسے پسند نہ تھا۔ سابق محبت سے دست بردار ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ جوزیفائن پر فریفتہ ہوگیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اکتوبر ۱۷۹۵ء میں جب نپولین بام عزت کی ابتدائی سیڑھیوں پر تھا، اس کے پاس ایک کم عمر لڑکا آیا، اور اپنے باپ کی تلوار واپس مانگی۔ یہ لڑکا فرانس کے مشہور سپہ سالار وائی کونٹ الکزنڈر کا بیٹا تھا، جسے فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں پھانسی دے دی گئی تھی۔ نپولین بچہ کی جرأت و فصاحت سے بہت خوش ہوا اور اس کی درخواست منظور کرلی دوسرے دن اس کی ماں شکریہ ادا کرنے آئی۔ یہی جوزیفائن تھی۔ نپولین پہلی ہی نظر میں اس پر عاشق ہوگیا۔

مورخین کا بیان ہے کہ دوسرے دن خود نپولین جوزیفائن کے چھوٹے سے مکان پر گیا۔ جوزیفائن واقعی بہت خوب صورت تھی، ساتھ ہی عقلمند بھی تھی۔ اس نے محسوس کرلیا کہ نپولین اس کی چشم و ابرو کا شکار ہوگیا ہے۔ چوں کہ اسراف کی وجہ سے سابق شوہر کی تمام

دولت خرچ کر کے مقروض ہو چکی تھی، اس لیے اس نے بھی اس نئی دعوت عشق کا پوری سرگرمی سے استقبال کیا اور تعلقات بڑھانا شروع کر دیے۔ چند ماہ کی آمد و رفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارچ ۱۷۹۶ء میں جنرل بوناپارٹ اور جوزیفائن کی شادی ہو گئی۔ دلہن کی عمر دولہا سے سات سال زیادہ تھی، مگر نکاح نامہ میں اس کی عمر ۲۹ برس لکھی گئی اور نپولین کی ۲۶ برس!

شادی کے دو دن بعد نپولین کو اٹلی کے حملہ پر جانا پڑا۔ سخت مصروفیت تھی، مگر جوزیفائن کی یاد ہر وقت تازہ رہتی تھی۔ ہر منزل پر سے خط کے ساتھ قاصد بھیجتا، اور اپنی حالت سے اسے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ پہلے خط میں لکھا تھا:

"جب جب اپنے دل پر ہاتھ رکھتا ہوں، تم اس میں موجود ملتی ہو جس سے مجھے بڑی تسکین ہوتی ہے۔ اس دنیا میں اگر کوئی غم ہے تو صرف تمہاری فرقت کا۔"

جوزیفائن کی تصویر ہر وقت اس کے پاس رہتی تھی۔ جب کہیں پڑاؤ ڈالتا تھا، تصویر نکال کر سامنے رکھ لیتا تھا۔ جب کوچ کرتا تھا تصویر جیب میں رکھ لیتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نیس میں اس کے ہاتھ سے تصویر کا آئینہ ٹوٹ کر گر گیا۔ اسے اس نے فال بد سمجھا۔ قریب تھا کہ جوزیفائن کی طرف سے بالکل ناامید ہو جاتا۔ مگر اسنے فوراً خط لکھا "کاش تمہارے پر ہوتے، اور تم اڑ کر میرے پاس آجاتیں!"

لیکن جوزیفائن اپنی رنگ رلیوں میں مصروف تھی۔ نپولین کی اسے ذرا بھی پروا نہ تھی۔ اب اسے پایۂ تخت میں بڑی عزت حاصل ہو گئی تھی۔ اچھے لوگ اس کی خوشامد میں لگے تھے۔ چند ہفتہ کے اندر نپولین نے اٹلی میں عظیم الشان فتوحات حاصل کر لیں اور اطمینان پاکر جوزیفائن کو بلا لینا چاہا۔ لیکن وہ برابر حیلے حوالے کرتی رہی۔ آخر نپولین نے سختی سے لکھا کہ "فوراً چلی آؤ"۔ اس مرتبہ اس نے ایک نیا عذر پیش کیا۔ اس نے لکھا کہ میں سفر نہیں کر سکتی کیوں کہ حمل سے ہوں۔ نپولین کو اس جھوٹی خبر سے بڑی ہی خوشی ہوئی۔ اس نے فوراً خط لکھا:

"جوزیفائن! میں نے سخت غلطی کی۔ کس طرح اپنے گناہ کا کفارہ کروں؟ میں نے ناحق تنگ کیا۔ حالاں کہ تم بیمار تھیں سچ ہے، محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے... کاش ایک ہی دن کے لیے میں تمہارے پہلو میں ہوتا!"

نیز اپنے بھائی کو لکھا:۔

"جوزیفائن کی علالت نے میرے ہوش اڑا دیے ہیں۔ کاش میں اسے لکھ سکتا۔ اس کی محبت جنون کے درجہ تک پہنچ گئی ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خدانخواستہ اگر وہ مر گئی تو زندگی میں میرے لیے کوئی لطف باقی نہیں رہے گا!"

لیکن چند ہی دن بعد نپولین کو معلوم ہو گیا کہ جوزیفائن نے دھوکا دیا تھا۔ وہ بالکل اچھی ہے، اور پیرس میں ضیافتیں دے رہی ہے۔ اب اس کے غصہ کی کوئی حد نہ تھی۔ اس نے فوراً تلخ لہجہ میں خط لکھا، اور حکم دیا کہ بلا کسی عذر کے روانہ ہو جائے۔ جوزیفائن بادل ناخواستہ روانہ ہو گئی۔ میلان نے نپولین نے بڑی مسرت سے استقبال کیا۔ مگر چند ہی دن بعد اسے پھر میدان جنگ میں جانا پڑا۔ کیوں کہ فوج ایک خطرہ میں پھنس گئی تھی۔ خطرہ دور کر کے اس نے پھر اسے طلب کیا۔ خط میں لکھا تھا:۔

"جدائی کے وقت تمہارے آنسوؤں نے میرے دل کو سخت مایوس کر دیا تھا۔ میری عقل جاتی رہی تھی۔ اب یہاں میرے پاس آ جاؤ، تاکہ مرنے سے پہلے ہم کہہ سکیں کہ ہم نے بھی چند دن خوشی کے دیکھے ہیں۔"

مورخ میسن کا بیان ہے کہ نپولین، جوزیفائن کے سامنے اس طرح کھڑا ہوتا تھا گویا کسی مقدس دیوی کے حضور میں کھڑا ہے۔

(نپولین کا رقیب)

جوزیفائن اپنے شوہر کے حسب الحکم جنگی پڑاؤ میں آ گئی۔ یہاں چارلس نام فوج میں ایک کم رتبہ افسر تھا۔ کم عمر اور خوب صورت تھا۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے، نپولین کی فوج میں اس سے زیادہ حسین آدمی کوئی نہ تھا۔ جوزیفائن دیکھتے فریفتہ ہو گئی۔ یا تو فوج میں رہنے سے بیزار تھی، یا اب فوج سے جدا ہونا گوارا نہیں کرتی تھی۔ دونوں میں شناسائی ہوئی، تعلقات بڑھے، اور اتنے بڑھے، کہ خود نپولین نے محسوس کر لیا۔ وہ نہایت غصہ ہوا مگر ضبط سے کام لیا۔ البتہ اتنا

ضرور کیا کہ اپنے رقیب کو فوج سے نکال کر پیرس بھیج دیا اور حکم دیا کہ آئندہ احکام کا منتظر رہے۔ اپنے شوہر کی اس کارروائی سے جوزیفائن کو سخت صدمہ ہوا۔ مگر مجبور تھی۔ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی پھوپھی کو ایک خط میں لکھتی ہے: "زندگی سے اکتا گئی ہوں۔ موت کی تمنائیں کر رہی ہوں۔"

جنگ اٹلی سے فارغ ہو کر دونوں میاں، بیوی بڑی شان و شوکت سے پیرس لوٹے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد نپولین کو پھر جوزیفائن سے علاحدہ ہونا پڑا۔ وہ مصر کی مہم پر روانہ ہو گیا، اور بیوی سے وعدہ لے لیا کہ جنگ ختم ہوتے ہی مصر چلی آئے گی۔ مگر ابھی وہ مالٹا ہی پہنچا تھا کہ اس عیش پسند عورت نے خاوند کو یک قلم بھلا دیا، اور جلسے شروع کر دیے۔ نپولین اب فرانس میں اس قدر ہر دل عزیز ہو چکا تھا کہ اس کی بیوی کی آزادیوں پر تمام پیرس ملامت کر رہا تھا۔ مگر خود اسے کچھ پروا نہ تھی۔ بہت جلد نپولین کو تمام رووداد معلوم ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں اسے سب سے پہلے جوزیفائن کو طلاق دینے کا خیال پیدا ہوا تھا۔

جوزیفائن سمجھتی تھی کہ نپولین شاید کبھی واپس نہ آئے گا، یا بہت مدت کے بعد آئے گا۔ اسی لیے بالکل بے باک ہو گئی تھی۔ مگر اچانک اسے خبر ملی کہ اس کا شوہر مصر سے آگیا ہے، اور عنقریب پیرس پہنچنے والا ہے۔ بہت خوف زدہ اور پریشان ہوئی۔ ایک طرف اپنی بے اعتدالیوں کا خوف تھا۔ دوسری طرف سخت مقروض بھی ہو گئی تھی۔ حیران تھی شوہر کو کیا جواب دے گی؟ مگر تھی چالاک۔ فوراً پیرس سے استقبال کے لیے روانہ ہو گئی۔ نپولین کو بھی اس کی روانگی کی خبر مل گئی تھی۔ اس نے بالکل مختلف راستہ اختیار کیا، اور محل میں آ کر تمام دروازے بند کر لیے۔ جوزیفائن اپنی تدبیر میں ناکام ہو کر سرعت سے لوٹی، اور سیدھی محل کی طرف روانہ ہو گئی۔ مورخ میسن کا بیان ہے :-

"جوزیفائن محل کے دروازے پر کھڑی دستکیں دیتی رہی۔ مگر نپولین نے کوئی شنوائی نہیں کی۔ پھر اس نے اپنے گھٹنوں پر جھک کر پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کیا۔ مگر اس پر بھی سپہ سالار نے مطلقاً پروا نہ کی۔ اس حالت پر پورا دن گزر گیا۔ مگر دروازہ نہیں کھلنا تھا نہیں کھلا۔ اب

جوزیفائن بالکل تھک گئی۔ ناامید ہوکر واپس جانیوالی تھی کہ اس کی ایک سہیلی اس کے دونوں بچوں اوجین اور ہورٹانس کو لے آئی۔ انھوں نے رکوع کرکے اپنے سوتیلے باپ کو پکارنا اور اپنی ماں کے لیے رو رو کر سفارشیں کرنا شروع کیا۔ معصوم بچوں کی آواز سن کر نپولین کا دل نرم پڑ گیا اور دروازہ کھول دیا۔ پھر جوزیفائن کو اٹھایا، آنسو پونچھے، معاف کیا، اور اس کا بیس لاکھ فرنک قرضہ بھی ادا کر دیا۔"

(جوزیفائن کو طلاق)

اس کے بعد جوزیفائن نپولین کے ساتھ رہی۔ جب وہ تخت نشین ہوا، تو اس نے ملکۂ فرانس کا تاج پہنا اور شہنشاہی کی عزت و عظمت کے ساتھ زندگی بسر کرتی رہی۔ یہاں تک کہ نپولین کو اپنے بعد اپنے جانشین کی فکر ہوئی۔ اس خیال نے دوسری سیاسی مصالح کے ساتھ مل کر اسے جوزیفائن کے طلاق پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ طلاق دے دی گئی، اور نپولین نے شہنشاہ آسٹریا کی لڑکی "میری" سے شادی کر لی۔

مشہور ہے کہ آسٹرین بیوی کو اپنے شوہر سے ذرا بھی محبت نہ تھی۔ بلکہ سخت نفرت کرتی تھی جیسا کہ ابھی بیان ہوگا۔ نپولین نے جزیرۂ سینٹ ہیلانا میں بستر مرگ پر اپنے ڈاکٹر کو وصیت کی تھی کہ موت کے بعد اس کا دل شیشہ میں رکھ کر اس کی بیوی کے پاس لے جائے۔ لیکن جب ڈاکٹر ملکہ کے پاس پہنچا، تو اسے ایک کانے عہدہ دار سے تعشق کرتے پایا۔ ملکہ نے نپولین کا پیغام سن کر کہا:-

"میں نے اس کی محبت کبھی اپنے دل میں محسوس نہیں کی۔ اگرچہ میں ہمیشہ یاد رکھنے پر مجبور ہوں کہ وہ میرے لڑکے کا باپ ہے۔"

مذکورہ بالا عورتوں کے علاوہ اور بھی بہت سی عورتوں سے نپولین کو محبت ہوئی یا انھوں نے اس سے محبت کی۔ ان میں سب سے اہم اور قابل ذکر تین عورتیں ہیں۔ میڈیم پولین، میڈیم ڈی اسٹائیل، اور مسز اربل۔ ہم ان کے واقعات بالاختصار بیان کریں گے۔

(الہلال: ۱۸ نومبر ۱۹۲۷ء)

مطبوعات جدیدہ :

رستم بن رضا

الہلال کے گذشتہ نمبر میں ہم نے ایک جرمن اہل قلم کی جدید کتاب کا ذکر کیا تھا جس میں اس نے نپولین کے بعض غیر مشہور گوشہ ہائے حیات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ابھی اس کتاب کی بہت سی دلچسپ اور عبرت انگیز داستانیں باقی ہیں، لیکن ہم چاہتے ہیں، مجلس کے تبدیل ذائقہ کے لیے اس کے ایک دوسرے حصہ پر قارئین الہلال کو توجہ دلائیں۔ یہ حصہ بھی تاریخی دلچسپی کے لحاظ سے پچھلی داستانوں سے کمتر نہیں ہے اس میں نپولین کی درباری زندگی کی ایک عجیب و غریب تاریخی شخصیت سے ان کی تقریب ہو گی۔ یہ شخصیت دس برس تک نپولین کے تمام عجائبات زندگی کی طرف یورپ کی ایک عجیب و غریب ہستی کا درجہ رکھتی تھی۔ حالاں کہ اس کی ابتدائی زندگی اس طرح شروع ہوئی تھی کہ وہ مصر کا ایک حبشی غلام تھا۔

یورپ کے تمام مورخین نے اس کا نام رستم بن رضا لکھا ہے۔ فرانس کے قیام کے بعد اس نے فرانسیسی زبان میں اس قدر قابلیت حاصل کر لی تھی کہ آخری عمر میں اپنی یادداشت حیات قلم بند کی۔ اس یادداشت میں اس نے خود اپنے قلم سے اپنے ابتدائی حالات لکھے ہیں۔ جرمن مصنف ہمیں بتلاتا ہے کہ یہ کتاب اس کے پیش نظر ہے۔

(مہیب آقا اور عجیب غلام)

گذشتہ صدی کے اوائل میں روئے زمین پر ایک طوفانی آندھی آئی۔ اس نے بادشاہوں کے تخت الٹ دیے۔ تاجداروں کے تاج گرا دیے۔ یہ ایک مہیب

جبار تھا جس کے سامنے تمام یورپ سربسجود ہو گیا تھا۔ اس مہیب آقا کے ساتھ ہمیشہ ایک عجیب و غریب غلام بھی دیکھا جاتا تھا۔ مہیب آقا نپولین تھا، اور عجیب الہیئت غلام رستم تھا۔

رستم بن رضا کوفان ۱۷۸۰ء میں تفلیس (قفقاز) میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن کوہ قاف کے مرغزاروں میں بسر ہوا تھا لیکن زمانے کے انقلابات نے اس کے دل و دماغ پر اس سرزمین کے حسن و جمال طبیعت کا کوئی اثر باقی نہیں چھوڑا۔ وہ نہ تو شاعر ہوا، نہ مصور۔ اس کی قسمت میں ایک عجیب انسان کا عجیب غلام بننا تھا۔

نپولین کے سکریٹری مینول نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے:۔

"رستم کا باپ طبیب تھا۔ بعض مورخین نے اسے تاجر بھی بتایا ہے۔ اس کے چار اولاد تھی۔ ان میں ایک رستم تھا۔ ۱۷۹۵ء تک وہ اپنے والدین کے ساتھ رہا۔"

خود رستم نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ وہ اپنی ماں سے از حد محبت رکھتا تھا یہی محبت اس کی تمام مصائب کا سبب ہوئی۔ باپ نے اسے گھر سے نکال دیا اور وہ آوارہ گردوں کی طرح گاؤں گاؤں پھرنے لگا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں وہاں کے امراء میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ رستم اس جنگ میں قید ہو گیا، اور بہت دنوں تک ایک قلعہ میں بند رہا۔ پھر وہاں سے بھاگا تاکہ اپنی ماں کی کفالت کرے۔ اب وہ اپنے شوہر سے علاحدہ ہو گئی تھی اور چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ لے کر کسی طرف چلی گئی تھی۔ بہت تلاش کے بعد رستم نے ماں کا پتہ لگا لیا اور اس کے ساتھ رہنے لگا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے ارادہ کیا کہ کسی شہر میں جا کر آباد ہو جائے اور اپنے خاندان کی پرورش کا انتظام کرے۔ وہ سب کو ساتھ لے کر چل دیا، مگر راستے میں بردہ فروش قزاقوں نے گھیر لیا، اور پورا قافلہ گرفتار ہو گیا۔ بردہ فروشوں سے ایک مالدار عورت نے رستم کو خرید لیا اور اپنا لڑکا بنا کر گھر میں رکھا۔ لیکن اس کے شوہر کو گھر میں اس خوب صورت نوجوان کی موجودگی ناگوار ہوئی۔ اس نے مصر کے ایک امیر کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

مصری امیر رستم کو مصر لایا۔ پھر اپنے ساتھ مکہ معظمہ لے گیا۔ حج کے بعد دونوں شام کے راستے واپس ہوئے۔ مگر ابھی راہ میں ہی تھے کہ معلوم ہوا، نپولین نے مصر پر قبضہ کر لیا ہے۔ امیر نے فیصلہ کیا کہ مصر نہ جائے اور اپنے دوست احمد پاشا جزار والی عکا کے یہاں قیام کرے۔ رستم نے لکھا ہے کہ احمد پاشا نے اپنی دوستی کا حق اس طرح ادا کیا کہ مصری امیر کو زہر دے کر مار ڈالا۔

(نپولین تک رسائی)

رستم نے اب اپنے سامنے ایک نئی مصیبت دیکھی۔ مجبوراً مصر بھاگ گیا۔ مصر میں ایک دوست نے اسے مشہور خاندان بکری کے سجادہ نشین شیخ السادات کی خدمت میں پیش کر دیا۔ شیخ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اپنے غلاموں کا افسر بنا دیا۔

شام کے حملے سے واپسی پر نپولین کے استقبال کے لیے مصر کے تمام امراء شہر کے باہر کھڑے تھے۔ سید بکری بھی موجود تھے۔ وہ نپولین کی سواری کے لیے ایک گھوڑا بھی لے گئے تھے۔ گھوڑے کی لگام، رستم کے ہاتھ میں تھی۔ نپولین نے گھوڑا شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔ چند دن بعد دو غلاموں کی فرمائش کی۔ سید بکری نے دو غلام حاضر کر دیے۔ انھیں غلاموں میں ایک رستم تھا۔ نپولین نے اپنی خدمت میں لیتے وقت رستم کو ایک مرصع تلوار اور طلائی دستے کے دو طپنچے عطا کیے۔

(فرانس میں داخلہ)

فرانس کی واپسی میں رستم بھی نپولین کے ساتھ تھا۔ راستے میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ البتہ ایک دن نپولین کے ساتھیوں نے ستانے کے لیے کہہ دیا کہ "جنرل تمہیں اس لیے ساتھ لیے جاتا ہے، تاکہ پیرس کے جلسے میں تمہاری بھینٹ چڑھائے۔" سادہ لوح غلام ڈر گیا، اور واویلا مچانا شروع کر دیا۔ نپولین نے سنا تو بہت ہنسا۔ اور وہ تمام رقم اسے بخش دی، جو دوران سفر میں اپنے ساتھیوں سے جوئے میں جیتی تھی۔

نپولین نے رستم کو مارسیلز میں چھوڑ دیا۔ ہر طرف لوگوں کی نظریں اس پر پڑتی تھیں۔ عورتیں تو اس پر ٹوٹ پڑیں۔ اس کے عجیب مشرقی اطوار اور حیرکسی چشم وابرو ان کے لیے نئی قسم کی چیز تھی۔ چند دن بعد نپولین کا اسباب لے کر وہ پیرس روانہ ہوا۔ راستے میں ڈاکو مل گئے، اور تمام اسباب لوٹ لیا۔ رستم کی مرصع تلوار اور چھ ہزار فرنک کی تھیلی بھی چھین لی۔

جوزیفائن، نپولین کی بیوی، رستم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اپنی خدمت میں قبول کر لیا۔ بعد میں لوگوں نے اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں کیں۔ کہا گیا کہ جوزیفائن غلام پر عاشق ہے۔ اسی قدر نہیں بلکہ یہاں تک کہا گیا کہ نپولین رستم کو محض اسی نیت سے لایا تھا، تاکہ جوزیفائن کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کر دے، اور خود اس کی نگرانی اور رشک سے آزاد ہو جائے۔

(رستم اور پیرس)

کچھ ہی سبب ہو، لیکن پیرس میں رستم کے ظہور نے نپولین کی عظمت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا۔ رستم اپنے بیش قیمت لباس میں "قنصل" (نپولین) کے ساتھ ساتھ پھرا کرتا تھا اور پیرس کی مخلوق اسے دیکھ کر متحیر رہ جاتی تھی۔

قنصل مقرر ہونے کے بعد نپولین اس محل میں اٹھ گیا، جو حکومت نے اسے دیا تھا۔ رات کو اس کے خاص کمرے کی نگہبانی رستم ہی کے ذمے تھی۔ وہ رات بھر دروازے پر پڑا رہتا تھا، اور کسی کو اندر جانے نہیں دیتا تھا۔

ایک دن جوزیفائن کو معلوم ہوا کہ نپولین کے ساتھ ایک عورت موجود ہے وہ غصے میں بھری ہوئی اٹھی اور کمرے میں گھس پڑنا چاہا۔ مگر رستم دروازے پر سو رہا تھا۔ اس کے خراٹے اتنے بلند اور خوفناک تھے کہ جوزیفائن ڈر گئی۔ شمع ہاتھ سے گر پڑی، اور بدحواس الٹے پاؤں بھاگی۔

دن کے وقت رستم کے فرائض یہ تھے کہ صبح اپنے آقا کو حجامت میں مدد دیتا تھا

بنولین نہایت تنگ مزاج تھا۔ بار بار چلا اٹھتا تھا۔" گدھے آئینہ سیدھا کر۔ خوش قسمتی سے تیرا آقا مصری نہیں ہے ورنہ گردن اڑا دیتا۔" حجامت کے بعد اپنے آقا کو نہلاتا تھا۔ پھر اس کے ساتھ دفتر جاتا تھا۔ اور ایک لمحہ کے لیے بھی جدا نہیں ہوتا تھا۔

کلیبر کہتا ہے:۔

"بنولین نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ لیکن وہ اپنی فیاضی سے دوسروں کی محبت خرید لیا کرتا تھا۔ ہمیشہ جوئے میں اپنی تمام جیت، رستم کو دے دیا کرتا۔ ایک مرتبہ پانچ دن کے اندر تین ہزار فرنک رستم کو مل گئے۔ اس تقرب کی وجہ سے تمام خادم رستم پر حسد کرنے لگے تھے۔ صرف خادم ہی نہیں، بہت سے بڑے بڑے آدمی بھی جلتے تھے۔ ان کا خیال تھا۔ رستم کی یہ تمام قدر دانی صرف اس لیے ہے کہ وہ اس کے دشمنوں کو خفیہ قتل کر ڈالتا ہے۔

رستم بنولین کے ساتھ سایہ کی طرح لگا رہتا تھا۔ حتیٰ کہ فوج کی قواعد کے وقت بھی آقا کے گھوڑے کے پہلو میں اس کا عربی گھوڑا نمایاں نظر آتا تھا۔ گھوڑے پر چیتے کی کھال کا زین ہوتا تھا۔ زین پر سونے کا کام تھا۔ خود رستم کا لباس، ریشم کا کارچوبی ہوتا، کہ دور دور تک اس کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔ وہ اس قدر شاندار ہوتا تھا کہ رستم، عرب بادشاہ معلوم ہوتا تھا، اور بنولین اس کا فرنگی سپہ سالار۔ تھیٹر میں بھی وہ بنولین کے پہلو میں بیٹھتا تھا۔ تمام نظریں غلام کی شان و شوکت کے تماشہ میں محو ہو جاتی تھیں۔"

جب کبھی وہ راستے میں تنہا ہوتا مخلوق ہجوم کر کے ساتھ ہو جاتی۔ مسرت کے نعرے بلند ہونے لگتے۔ اپنے فاتح آقا کی طرح یہ غلام بھی اپنی عظمت و غرور میں مدہوش رہتا تھا۔ وہ بالکل پروا نہ کرتا کہ لوگ اس کی تعریف میں نعرے لگا رہے ہیں، یا تضحیک کر رہے ہیں۔

(رستمی فیشن)

پیرس کی نازنینوں کے لیے رستم ایک متحرک فتنہ بن گیا تھا۔ وہ ان کی نظر میں مشرقی حسن وجمال کا ایک پراسرار پیکر تھا۔ یہاں تک کہ اس کے لباس کی بھی نقل اتاری جانے لگی۔ یہ پیرس کا سب سے زیادہ مقبول فیشن "رستمی فیشن" ہو گیا۔ خود جوزیفائن اس لباس پر فخر کرتی تھی۔ فرانس سے نکل کر یہ فیشن جرمنی پہنچا، اور لیزا ملکۂ پروشیا تک نے اختیار کر لیا۔ عورتوں کی طرح مرد بھی اس کی تقلید کرنے لگے تھے۔ یہ بیماری ایسی عام ہوئی کہ خود نپولین بھی مبتلا ہو گیا۔ اس نے بھی رستم کا سا لباس اپنے لیے بنوایا تھا اور بڑے بڑے جلسوں میں پہن کر جاتا تھا۔

اس عہد کے ماہر مصوروں نے رستم کی تصویریں اتاریں۔ اخبارات ورسائل نے خاص اہتمام سے شایع کیں۔ پورے یورپ میں اس کی شہرت عام ہو گئی۔

جب نپولین کی تاج پوشی قریب آئی، تو اس نے درباری درزی کو حکم دیا کہ رستم کے لیے بیش قیمت خلعت تیار کرے۔ یہ خلعت اس قدر گراں قدر تھا کہ صرف کوٹ پر سات ہزار تین سو فرنک خرچ ہوئے تھے۔ جوتے کی قیمت ایک سو بیس فرنک تھی۔ یہ رقم اس زمانے میں ایک شاہی لباس ہی پر خرچ ہو سکتی تھی۔

تاج پوشی کے جلوس میں رستم اپنے خاص لباس میں ملبوس شہنشاہ کے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔ وہ خود بھی اپنے گھوڑے پر ایک شہنشاہ معلوم ہوتا۔ ہر طرف اس کے اعزاز میں تالیوں کا شور بلند تھا۔

(منتہائے عروج)

رستم نے اپنی زندگی کے بہترین ایام شہنشاہ نپولین کے زیر سایہ بسر کیے۔ دربار میں اسے اتنا عروج حاصل تھا کہ خاص و عام سب حسد کرتے تھے۔ نپولین جب کوئی شہر فتح کرتا تھا تو شاہی گاڑی میں فاتح کے پیچھے رستم ہی بیٹھتا تھا۔ ناواقف اسے سلطنت

کارکن اعظم خیال کرتے تھے۔ بہت سے لوگ اس کی خوشامدیں کرتے، تاکہ اس کے ذریعہ نپولین کی خوشنودی حاصل کرلیں۔

جب نپولین پیرس میں، ہوتا تو رستم کو دو گھنٹے تفریح کی اجازت ملتی۔ وہ اپنے ان دوستوں سے ملنے جایا کرتا جن کے یہاں خوب صورت عورتیں ہوتیں۔ لیکن میدان جنگ میں اسے ایک لمحہ کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ کیوں کہ اس کے فرائض ہر لمحہ اسے شہنشاہ کے ساتھ رہنے پر مجبور کرتے تھے۔ وہی اس کے لیے کھانے کا بھی انتظام کرتا تھا۔

نپولین کے کھانے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ بسا اوقات وہ کھائے بغیر ہی سو جاتا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ نپولین آدھی رات کو اپنے بستر پر گیا اور کھانا طلب نہ کیا۔ رستم نے خیال کیا کہ اب وہ کھانا نہیں کھائے گا۔ اس نے بھنی ہوئی مرغی خوشی خوشی کھانا شروع کردی۔ لیکن ابھی آدھی مرغی بھی کھانے نہیں پایا تھا کہ نپولین نے کھانا مانگا۔ رستم بہت گھبرایا، مگر اب کرہی کیا سکتا تھا؛ وہی بچی ہوئی مرغی لے کر حاضر ہوگیا۔ نپولین دیر تک مرغی دیکھتا رہا۔ پھر غلام پر غضبناک نظریں ڈالیں اور کہا۔" میں نہیں جانتا تھا کہ بعض مرغیوں کا صرف ایک ہی بازو اور ایک ہی ٹانگ ہوتی ہے۔ مجھے کبھی اس بات کا وہم بھی نہیں گزرا تھا کہ دوسروں کا جھوٹا کھانا پڑے گا۔"

رستم ڈر گیا۔ رنگ فق ہوگیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔" مہربان آقا! میں بہت بھوکا تھا۔ پہلے ارادہ صرف ران کھانے کا تھا۔ مگر افسوس۔ بازو بھی میں نے کھالیا۔" نپولین چپ ہوگیا، اور مرغی کھالی، صبح اس نے ایک سپہ سالار کو بعض احکام دینے کے لیے طلب کیا۔ رستم بھی سامنے کھڑا تھا۔ نپولین نے سپہ سالار سے کہا۔" تم نے کچھ سنا؟ کل رات میں نے آقائے رستم کا پس ماندہ کھایا تھا۔ ملعون! ادھر آ۔ میں تیرے کان ملوں گا۔ خبردار! پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔" یہ کہہ کر نپولین زور سے ہنس پڑا۔

(شادی)

رستم، اپنے آقا کو روز پیرس کی عورتوں سے اپنے عشقیہ معرکوں کی داستانیں سنایا

کرتا تھا۔ نپولین کو ان واقعات سے بڑی دلچسپی ہوتی تھی اور وہ غلام کی ہمت افزائی کیا کرتا تھا۔ آخر رستم کا یہ شوق رنگ لایا۔ اور وہ ایک عورت پر عاشق ہو گیا۔ اس نے شہنشاہ سے شادی کی درخواست کی۔ نپولین نے پوچھا۔ "وہ کچھ مالدار بھی ہے؟" رستم نے جواب دیا "جب تک حضور کے قدموں سے لگا ہوں، مجھے مال کی کیوں فکر ہو؟" نپولین کو یہ جواب پسند آیا اور شادی کی اجازت دے دی۔

یکم فروری ۱۸۰۶ء میں الکزنڈرائن دوریل سے رستم کی شادی ہو گئی۔ خود شہنشاہ جلسہ میں شریک ہوا، اور تمام خرچ اپنی جیب خاص سے ادا کیا۔ شادی کے ایک برس بعد لڑکا پیدا ہوا۔ رستم نے اس کا نام ایشیل رکھا۔ نپولین کو یہ بچہ بہت پیارا تھا۔ اکثر بلا کر اس سے کھیلا کرتا تھا۔ جب وہ لوٹتا تھا، تو اس کی دونوں مٹھیوں میں اشرفیاں ہوتی تھیں۔

نپولین کو رستم اس قدر عزیز تھا کہ سفر اٹلی کے موقعہ پر جب وہ بیمار ہو گیا تو نپولین نے چلتے وقت اس سے کہا۔ "رنج نہ کرنا۔ میں جلد واپس آؤں گا۔ میری بیوی تمہاری خبر لے گی۔"

خود رستم نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ شہنشاہ اس پر بے حد مہربان تھا۔ شروع میں نپولین نے اس کی کوئی تنخواہ مقرر نہیں کی تھی۔ ایک دن اتفاق سے یاد آ گیا تو فوراً ۱۲۰۰ فرنک مقرر کر دیے۔ تھوڑی ہی مدت بعد یہ رقم دوگنی کر دی گئی۔ یعنی ۲۴۰۰ فرنک ملنے لگے۔ نیز ۲۴۰۰ فرنک شکار میں بادشاہ کی بندوق اٹھانے کے لیے، اور ۹۰۰ فرنک دائمی انعام کے طور پر بھی ملتے تھے۔ اس کے علاوہ کھیل میں جس قدر روپیہ نپولین جیتتا تھا، سب اسے دے دیتا تھا۔ عیدوں اور جشنوں کے موقعہ پر بھی بہت کچھ دیتا تھا چنانچہ ۲۰۰۰ فرنک ۱۸۰۸ء میں دیے۔ ۳۰۰۰ ۱۸۱۰ء میں دیے۔ ۴۰۰۰ ۱۸۱۱ء میں دیے۔ اور ۶۰۰۰ ۱۸۱۳ء میں دیے۔ ۶۰۰۰ ۱۸۱۴ء میں دیے۔ پھر معزولی سے پہلے ایک مرتبہ یکمشت ۵۰۰۰۰ فرنک عطا کیے۔

(رستم کا خاتمہ)

لیکن افسوس ہے کہ مصیبت کے وقت رستم بے وفا ثابت ہوا۔ آقا کے تمام احسانات بھول کر اس سے رخ پھیر لیا۔

۴۔ اپریل ۱۸۱۴ء میں نپولین کو تخت سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ وہ جب جزیرۂ البا کی طرف روانہ ہونے لگا، تو رستم، بلا اجازت اپنی بیوی سے مشورہ کرنے چلا گیا۔ بیوی شریف تھی۔ اس نے کہا۔ "تمہارا فرض ہے کہ اس نازک وقت میں اپنے مہربان آقا کا ساتھ نہ چھوڑو۔" نپولین کو امید نہیں تھی کہ رستم لوٹے گا۔ مگر دوسرے دن دیکھا تو وہ موجود تھا۔ اس نے اپنے بلا اجازت چلے جانے پر افسوس و ندامت کا اظہار کیا اور نپولین کا دل اس کی طرف سے صاف ہو گیا۔

اسی اثنا میں نپولین نے اپنی ناکامیوں سے مضطرب ہو کر زہر کھا لیا، مگر ڈاکٹروں نے اس کی جان بچا لی۔ ایک دن اس نے رستم سے پستول طلب کیا۔ رستم نے مارشل برتیہ سے مشورہ کیا۔ مارشل نے کہا جو جی میں آئے کرو۔ میں کوئی مشورہ نہیں دوں گا۔ لیکن بعض دوستوں نے کہا۔ اگر شہنشاہ خودکشی کرے گا تو دنیا تمہیں کو الزام دے گی۔ کہا جائے گا، تم نے دشمنوں سے رشوت لے کر پستول نپولین کے حوالہ کر دیا۔ تاکہ وہ خودکشی کر لے۔

اس واقعہ کو رستم نے حیلہ بنایا، اور نپولین سے ہمیشہ کے لیے علاحدہ ہو گیا۔ جلاوطن ہوتے وقت شہنشاہ نے اپنے غلام کی بابت سوال کیا۔ اور جب اس کی بے وفائی کا حال سنا تو قدرتی طور پر بہت رنجیدہ ہوا۔

رستم کی بے وفائی اسی پر ختم نہیں ہو گئی، بلکہ وہ دو مرتبہ انگلستان بھی گیا۔ وہاں نپولین کے دشمنوں کے سامنے اپنا شاہی خلعت پہن کر جایا کرتا تھا۔ انگریزوں کے ہاتھ اس نے اپنے آقا کی بہت سی یادگاریں بھی بیچ ڈالیں۔ انھیں میں سونے کا ایک ٹکڑہ بھی تھا۔ اس پر لکھا تھا۔ "نپولین کی یادگار اپنے وفادار غلام رستم کے لیے۔"

۷۔ دسمبر ۱۸۴۵ء کو اس کا انتقال ہوا۔ اس کی قبر اب تک [illegible] ی عبلر [illegible] موجود ہے۔

اور اس پر یہ عبارت کندہ ہے:-

"یہاں شہنشاہ نپولین کا غلام رستم رضا سو رہا ہے۔"

اس کی زندگی ہی میں اس کے دونوں لڑکے مر چکے تھے۔ صرف بیوہ اور ایک لڑکی باقی رہی۔ لڑکی کی شادی ایک فرانسیسی تاجر سے ہو گئی تھی۔

(الہلال، ۲۵ نومبر ۱۹۲۷ء)

نپولین اور اس کی اخلاقی زندگی

(میڈم پولین سے محبت)

(۱)

اس عورت سے نپولین کو مصر میں عشق ہوا تھا۔

گیرٹرڈ اریٹز (Gertrude Aretez) جس کی جدید الشیوع کتاب کا ذکر ان صفحات پر ہو چکا ہے، میڈیم پولین کی نسبت لکھتا ہے:۔

"اس معاملہ کی تفصیل یہ ہے کہ ۹ مئی ۱۷۹۸ء کو نپولین مصر کی فتح کیلئے روانہ ہوا وہ اپنے دو دشمنوں سے بہت زیادہ خائف تھا، اور ان کی آنکھ بچا کر نکل جانا چاہتا تھا یعنی انگریزی امیر البحر نلسن، اور انگریزی جاسوس جان بارنٹ۔

اس سفر میں نپولین نے چند خاص عورتوں کے سوا عورتوں کی رفاقت ممنوع قرار دے دی تھی۔ جن عورتوں کو چلنے کی اجازت دی گئی تھی، ان میں خود اس کی داشتہ میڈیم وردیا بھی تھی۔ جسے وہ اٹلی سے اپنے لایا تھا۔"

(۲)

اس فوج میں لیو فوریس نامی ایک فوجی افسر تھا۔ اس نے حال ہی میں شادی کی تھی۔ اس کا دل اپنی بیوی کی جدائی پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ عورتوں کو ساتھ لے جانے کی ممانعت تھی۔ آخر اس نے یہ ترکیب نکالی کہ بیوی کو سپاہی کی وردی پہنا کر اپنے ساتھ لے لیا۔ تاکہ دونوں بے روک ٹوک ساتھ رہ سکیں۔

اس وقت کے اکثر مورخین کا بیان ہے کہ ماہ اگست میں نپولین نے قاہرہ کے باہر ایک جلسہ کیا تھا، جس میں اس کا پورا جنگی اسٹاف اور تمام عورتیں شامل تھیں۔ اسی جلسہ کے موقعہ پر نپولین نے میدان میں اپنی فوج کا ایک دستہ گدھوں پر سوار دیکھا، سپاہیوں

میں ایک شخص غایت درجہ خوش آواز، خوب صورت، اور دلربا تھا۔ نپولین نے جنرل برتیہ کو حکم دیا کہ اس شخص کا پتہ لگائے۔ اسی دن شام کو جنرل نے یہ عجیب خبر سنائی کہ "وہ سپاہی مرد نہیں ہے۔ عورت ہے۔ اور بائیسویں رسالہ کے ایک افسر کی بیوی ہے۔"

دوسرے دن نپولین نے جنرل کو ایک دعوت منعقد کرنے کا حکم دیا۔ اس میں بڑے بڑے جنرل، افسر، اور ان کی عورتیں مدعو کی گئی تھیں۔ خصوصاً میڈم فوریس بھی خصوصیت کے ساتھ بلائی گئی تھی۔

(۳)

چنانچہ دعوت کا جلسہ منعقد ہوا۔ میڈم بغیر اپنے شوہر کے بلائی گئی تھی۔ اس کے شوہر نے شروع میں تو جانے سے منع کیا۔ لیکن پھر ڈرا، اور اجازت دے دی۔ چنانچہ تمام مہمان جمع ہوئے۔ حسب معمول نپولین برآمد ہوا۔ سب تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ وہ لوگوں سے ہنستا بولتا جنرل تک پہنچا، جس کے پاس میڈم فوریس اور متعدد ممتاز سپہ سالار کھڑے تھے۔ جنرل قائد اعظم کا خیر مقدم بجا لایا، تشریف آوری پر شکریہ ادا کیا، اور ایک پیالی چائے نوش کر لینے کی درخواست کی۔ درخواست منظور ہوئی، اور نپولین بیٹھ گیا۔ میڈم بالکل اس کے مقابل کھڑی تھی۔

میڈم فوریس نے دیکھا، سپہ سالار اسے پر معنی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ بہت کم عمر تھی، شرما گئی۔ نپولین اس کی حالت کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ مگر بالکل خاموش رہا۔ چائے جلدی پی لی، اور بغیر ایک لفظ کہے جلسہ سے اٹھ گیا۔

مہمانوں نے رات کا کھانا کھایا۔ اور کافی پینے لگے۔ میڈم فوریس جس میز پر تھی، اس کے ایک طرف جنرل ڈی بوی بیٹھا تھا۔ دوسری طرف جنرل جونو۔ آخرالذکر نے کافی کی بھری ہوئی پیالی جان بوجھ کر اس طرح میڈم فوریس پر گرادی، کہ سب نے اسے اتفاقی حادثہ سمجھا۔ لوگ لپکے اور خاتون کا لباس صاف کرنے لگے۔ جنرل جونو نے اپنی غفلت پر بڑی فصاحت سے ندامت کا اظہار کیا۔ فوراً کافی کا دھبہ پانی سے دھلوایا گیا جس سے میڈم کا لباس اور زیادہ بھیگ گیا۔ اس پر جنرل نے کہا "آپ کپڑا خشک کرنے کے لیے مکان کی بالائی منزل پر چلی جائیے"، میڈم چلی گئی۔ وہاں نپولین منتظر بیٹھا تھا!

دعوت کے تیسرے دن میڈم کے شوہر فوریس کو حکم ملا کہ جنرل بر تیہ سے ملاقات کرے۔

جنرل نے بڑی بشاشت سے افسر کا خیر مقدم کیا، اور کہا "دوست! تم بڑے ہی خوش نصیب ہو۔ کیوں کہ فرانس جا رہے ہو۔ سپہ سالار تمہیں ایک خفیہ مہم پر پیرس بھیج رہا ہے۔ ایک گھنٹہ کے اندر روانہ ہو جاؤ۔ یہ لو، اسکندریہ کے سپہ سالار کے نام حکم ہے کہ تمہارے سفر کے لیے ہر طرح کی سہولیتیں بہم پہنچا دے۔"

فوریس بد حواس ہو گیا۔ حیران تھا، کیا جواب دے؟ آخر کار افسردگی سے جنرل کا شکریہ ادا کیا اور کہا "اگر مجھے فوراً ہی روانہ ہو جانا ہے تو میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔"

جنرل نے غصہ سے کہا "بیوی! کیا تم یہ سمجھتے ہو ایک ایسے نازک کام میں اپنے ساتھ اپنی بیوی کو لے جا سکتے ہو؟ خصوصاً جب کہ راستہ میں انگریزی بیڑہ موجود ہے اور تمہیں قید کر لے سکتا ہے؟"

اب غریب فوریس کے لیے بجز اطاعت کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ وہ ۱۸ دسمبر ۱۷۹۸ء کو اسکندریہ پہنچا اور فرانسیسی جہاز "شاسور" نامی پر سوار ہو گیا۔ اس جہاز کا کپتان لارنس تھا۔

لیکن فوریس یہ دیکھ کر نہایت متعجب تھا کہ اس کا جہاز سیدھا راستہ اختیار کرنے کی جگہ کچھ عجیب پیچ و خم کے ساتھ جا رہا ہے۔ اس نے کپتان سے پوچھا، تو اس نے کہا "انگریزی بیڑہ ہر طرف منڈلا رہا ہے۔ اس سے بچ کر چلنا ضروری ہے۔"

کپتان دراصل سکھایا پڑھایا ہوا تھا۔ اس سے کہہ دیا گیا تھا کہ جہاز انگریزوں کے ہاتھ قصداً گرفتار کرا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ چند دنوں کے بعد فوریس انگریزی بیڑہ میں قید تھا۔ انگریزی جہاز "لیون" نے فرانسیسی جہاز دیکھ لیا تھا اور گرفتار کر لیا تھا۔

(۵)

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اس حادثہ سے غریب فوریس کو کس درجہ صدمہ ہوا؟ ایک طرف اپنی رفیق حیات کی جدائی کا صدمہ مارے ڈالتا تھا۔ دوسری طرف اپنی سرکاری مہم کی ناکامی کا داغ تھا۔ وہ انگریزی جہاز "لیون" کے ایک کمرے میں مقید تھا، اور رہ رہ

کر کپتان لارنس کو کوس رہا تھا۔ اگر اس نے سمندر میں غلط راستہ اختیار نہ کیا ہوتا تو یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ اب ایک بڑی مدت تک کے لیے وہ آزادی سے محروم ہوگیا تھا۔ کیوں کہ وہ جنگی قیدی تھا۔ اس لیے اس کی رہائی صرف دو ہی صورتوں میں ہوسکتی تھی۔ یا تو دونوں حکومتوں میں صلح ہوجائے، یا باہم دگر جنگی قیدیوں کا مبادلہ کیا جائے۔ لیکن یہ دونوں صورتیں قریب الوقوع نہ تھیں۔

فوریس اپنے غم انگیز خیالات میں محو تھا۔ یکایک اس کی کوٹھری کا دروازہ کھلا، اور ایک انگریز داخل ہوا۔ یہ اس عہد کا مشہور انگریز جاسوس جان بارنٹ تھا۔ جسے نپولین نلسن سے کم خطرناک نہیں سمجھتا تھا۔

فوریس نے اس کی صورت دیکھتے ہی خیال کیا کہ غالباً یہ اس مہم اور اس کے مقاصد کے نسبت سوالات کرے گا۔ جو سرکاری مراسلت لے کر فوریس فرانس جا رہا تھا، وہ گرفتاری کے وقت ہی اس سے لے لی گئی تھی۔ سب سے زیادہ صدمہ اسے اسی مراسلت کے دشمنوں کے ہاتھ پڑ جانے کا تھا۔ وہ اپنے دل میں کہنے لگا۔ "نہیں معلوم اس مراسلت میں کیسے کیسے اہم راز ہوں گے جو افسوس کہ دشمنوں کے علم میں آگئے۔ بہرحال خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، میں ان کم بختوں کے سوالات کا کوئی جواب نہیں دوں گا۔"

لیکن شدت حیرت سے وہ مبہوت ہوگیا، جب اس نے دیکھا کہ جان بارنٹ نے وہی مراسلت جیب سے نکالی، اور فوریس کو دیتے ہوئے کہا:۔

"میرے دوست! یہ تمہارا سربمہر لفافہ موجود ہے۔ دیکھ لو! ہم نے کھولنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ اس کی تمام مہریں اپنی اصلی حالت میں قائم ہیں۔ ہمیں کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کے مضامین سے واقف ہوں۔ یہ مراسلت تمہیں واپس دے دی جاتی ہے۔ اسے لے لو۔ شاہی حکم کی رو سے اب تم آزاد ہو۔ تمہیں عنقریب مصر کے ساحل پر پہنچا کر رخصت کر دیا جائے گا۔"

یہ بات صورت حال کے اس درجہ خلاف تھی، کہ کئی لمحہ تک فوریس باور نہ کرسکا۔ آخر اس نے کہا:۔

"کیا آپ کا واقعی یہی مطلب ہے کہ یہ مراسلت میں لے لوں، اور مجھے مصر کے ساحل پر اتار دیا جائے گا؟"

"یقیناً" انگریز جاسوس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس لیے کہ میرے دوست! جب تم قاہرہ واپس جاؤ گے، تو دیکھ لو گے کہ تمہاری بیوی بونا پارٹ کی آغوش میں ہے۔"

(۶)

اصل واقعہ یہ ہے کہ نپولین اور میڈیم فوریس کے تعلقات کی پوری سرگزشت انگریزی جاسوس نے معلوم کر لی تھی۔ اسکندریہ اور دمیاط میں ان کے آدمی موجود تھے، اور الفی بک مملوک کی اعانت سے تمام مصر کی خبریں معلوم کرتے رہتے تھے۔ جب جان بارنٹ کو معلوم ہوا کہ نپولین نے فوریس کو اس لیے روانہ کر دیا ہے تاکہ مصر سے دور ہو جائے اور وہ خود اس کی بیوی کے ساتھ بے غل وغش عیش کرے، تو اس نے انگریزی بیڑہ کے افسروں کو اس کی اطلاع دے دی۔ جب فرانسیسی جہاز کی گرفتاری کے بعد فوریس کا نام معلوم ہوا تو فوراً پہچان لیا گیا کہ میڈم فوریس کا شوہر یہی ہے۔ وہ اسے گرفتار رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ کیوں کہ اس طرح وہ نپولین کے دلی مقصد کی تکمیل کر دیتے۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ جہاں تک جلد ممکن ہو، اسے مصر واپس کر دیا جائے، تاکہ نپولین کے سر پر مسلط ہو جائے۔ انگریزوں کو یقین تھا کہ فوریس جوش انتقام میں اپنے رقیب کو قتل کر ڈالے گا، اور اس طرح اس بلا سے انھیں نجات مل جائے گی۔

(۷)

ادھر مصر میں یہ ہوا کہ فوریس کے روانہ ہوتے ہی اس کی بیوی نپولین کے قبضہ میں آگئی اور شب و روز ساتھ رہنے لگی۔ نپولین کا اب اس سے تعلق بالکل علانیہ تھا۔ چند دن بعد تمام فوج میں یہ خبر پھیل گئی، اور سپاہی میڈم کو "ہماری مشرق کی ملکہ" کہہ کر پکارنے لگے۔

لیکن ابھی چند ہفتے بھی اس حالت پر نہیں گزرے تھے کہ اچانک فوریس قاہرہ پہنچ گیا۔ انگریزی جہاز نے نہ صرف اسے مصر پہنچا دیا، بلکہ اسکندریہ میں ایک انگریزی جاسوس

نے تمام ضروری معلومات بھی بہم پہنچا دیں۔ اسے معلوم ہو گیا کہ نپولین نے قاہرہ میں ایک خاص مکان اس کی بیوی کے لیے مخصوص کر دیا ہے، اور وہ بڑے امیرانہ ٹھاٹ سے وہیں رہتی ہے۔

وہ سیدھا اس مکان کی طرف چلا۔ واقعی اس کی بیوی قیمتی لباس میں ملبوس موجود تھی۔ شوہر کو اس طرح اچانک دیکھ کر ڈر گئی، اور صاف صاف نپولین کے تعلقات کا اقرار کر لیا۔ اب فورس کے لیے غیظ و غضب ضبط کرنا ناممکن تھا۔ اس نے بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ مارتے مارتے تھک گیا۔ اور عورت بے دم ہو کر گر پڑی۔

اس کے بعد کیا واقعات پیش آئے؟ ان کی تفصیلات تاریخ تک نہیں پہنچ سکیں۔ لیکن دو باتوں کا نپولین کے وقائع نگاروں نے ذکر کیا ہے۔ ایک یہ کہ فورس نے طلاق کی درخواست پیش کر کے اپنی بیوی سے علاحدگی کر لی تھی۔ دوسری یہ کہ فورس مصر سے فرانس واپس آ کر عرصہ تک زندہ رہا تھا۔

جان بارنٹ کا خیال تھا کہ فورس نپولین کو قتل کر ڈالے گا، لیکن نپولین ایسی ہستی نہ تھی جو اس آسانی سے قتل کر ڈالی جاتی۔ ابھی اسے زندہ رہنا تھا اور تمام یورپ کو منقلب کر دینا تھا۔

(الہلال: ۲ر دسمبر ۱۹۲۷ء)

غدر ۱۸۵۷ء
اور
تصویر کا دُوسرا رُخ

کئی ہفتے گزرے، الہلال میں ایک امریکن مصنف کی جدید الشیوع کتاب کے بعض حصوں کا ترجمہ شایع کیا گیا تھا جو غدر ۵۷ء کے حوادث پر تاریخی حیثیت سے لکھی گئی ہے۔ یہ ترجمہ چودھری محمد علی صاحب وکیل ایبٹ آباد کے قلم سے نکلا تھا۔ اب انھوں نے کتاب کے بعض دیگر حصص کا ترجمہ بھی بغرض اشاعت بھیج دیا ہے۔ آج ہم پھر یہ سلسلہ شروع کرتے ہیں، پہلی قسط درج ذیل ہے۔"

جن دنوں یہ وحشیانہ مظالم ظہور پذیر ہو رہے تھے، بعض نامور انگریزوں نے ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ ہم آج تک اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ اس قلیل جماعت نے اکثریت کی وحشیانہ حرکات کے خلاف نفرت کا اظہار کیا تھا۔ لارڈ کیننگ ویسرائے ہند ۲۱ جولائی ۵۷ء کو دیہاتوں کا جلانا ممنوع قرار دے دیا اور نہتے آدمیوں کو سزا دینے سے بھی حکماً روک دیا گیا۔ جن افسروں نے عوام الناس سے وحشیانہ سلوک کیا تھا، ان سے اختیارات چھین لیے گئے۔ ۲۸ اگست ۵۷ء کو گرانٹ صوبجات متحدہ میں بہ طور لفٹننٹ گورنر مقرر کیا گیا تاکہ وہ الہ آباد اور دیگر مقامات میں ان لوگوں کو بچائے، جو بلا تمیز پھانسی دیے جا رہے تھے۔ مگر کیننگ اور گرانٹ ایسے نرم دل واقع ہوئے تھے کہ ماتحت افسران کے احکام کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے۔ بایں ہمہ

انگریزوں نے ان کے خلاف بڑا شور مچایا۔ اور وائسرائے کو تو وہ نرم دل کیننگ کہا کرتے تھے۔

ماہ اگست میں جب انگریزی فوج کا ایک دستہ کسی گاؤں کو جلا کر واپس آرہا تھا، راہ میں وفادار سپاہیوں کا ایک دستہ مل گیا۔ وہ بھی ان کی سنگینوں کا شکار ہوئے۔ جرنیل اوٹرم اس واقعۂ جانکاہ کو "سفاکانہ قتل" سے تعبیر کیا کرتا تھا۔ لنڈن ٹائمز نے بھی ایسے بزدلانہ جرائم کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا۔

یہ امر مسلم ہے کہ بہت سے ہندوستانی سپاہی ہمارے مظالم سے گھبرا گئے اور اپنی پلٹنیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بعد ازاں وہ بغاوت کرنے پر مجبور ہو گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے جان توڑ کر ہمارا مقابلہ کیا۔ جس سے ہمیں سخت نقصان برداشت کرنا پڑا۔ انھیں یقین تھا کہ جو کوئی بھی انگریزوں کے ہاتھ آ گیا اس کی جان سلامت نہیں رہے گی۔

لفٹنٹ رابرٹ جو بعد میں فیلڈ مارشل کے عہدے پر ممتاز ہوا، اپنی ہمشیر کو ایک خط میں لکھتا ہے:۔

> "میری پیاری ہریٹ تم کو ہرگز یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ جو سپاہی ہمارے خلاف بغاوت کر رہے ہیں، میں ان پر ترس کھاتا ہوں۔ میں ایسا سنگدل ہو گیا ہوں کہ مجھے ان کی بے کسی پر مطلق رحم نہیں آتا۔ جب کوئی قیدی گرفتار کر کے پیش کیا جاتا ہے، تو سب سے پہلے میں ہی چلا اٹھتا ہوں "فی الفور پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔"

دہلی کے محاصرے کے دوران میں ایک افسر لکھتا ہے:۔

> "دشمن نے صلح کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انگریز بغیر قتل کیے اور کسی شرط پر راضی نہیں ہوں گے اور ان کا خیال بالکل درست ہے۔"

گریٹ ہیڈ ایک خط میں اس افسر کے رائے کی تاکید کرتا ہے۔

سر جارج کیمبل اپنی سوانح عمری میں اس بات پر بڑا زور دیتا ہے کہ سپاہیوں نے درحقیقت بغاوت کر کے سخت نمک حرامی کا ثبوت دیا۔ لیکن جب اندھیر نگری مچ گئی تھی۔ تو ہمیں ان کی

وفاداری پر قطعاً امید نہیں کرنی چاہیے تھی. کیوں کہ وہ ہمارے ہم وطن نہ تھے. جب انھوں نے دیکھا کہ ہماری طاقت معدوم ہو چکی ہے تو پھر ان کا باغیوں سے جاملنا اتنا سنگین جرم نہ تھا جتنا ہم سمجھتے ہیں. با ایں ہمہ ہمیں حیرت ہے کہ بہت تھوڑی فوجوں نے بغاوت میں حصہ لیا. جہاں کوئی فوج بغاوت کرتی تھی، وہ عموماً اپنے انگریز افسروں کو قتل کر دیتی تھی. لیکن برعکس اس کے عوام الناس نے اکثر ہماری امداد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا. کئی دفعہ ہندوستانیوں نے انگریزوں کی جان بچا کر اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال دیا. لیکن ہم نے ان لوگوں کی قربانی اور انسانیت کا بدلہ یوں دیا کہ باغی سپاہیوں کے ہمراہ انھیں بھی بلا تمیز قتل کرتے رہے.

ملکہ وکٹوریہ اپنے خطوط میں (جو حال ہی میں کتاب کی شکل میں شایع ہوئے ہیں) غدر کے واقعات کے متعلق یوں لکھتی ہیں :-

"ہماری فوجوں نے باغیوں سے سخت انتقام لیا. جس کی وجہ سے وہ سخت بدنام ہوئیں. کیوں کہ انھوں نے سخت بے رحمی سے بدلہ لیا تھا مگر لارڈ کیننگ کو بھی اس کی نرم مزاجی کی وجہ سے یہاں لعن طعن کیا جاتا ہے. عوام الناس کی رائے ہے کہ فوج اور سول کے افسروں نے غدر کو کچل دینے کے لیے جو کچھ انتظامات کیے تھے، وہ بالکل ضروری تھے اور اگر یہ افسر سختی سے کام نہ لیتے تو بغاوت اتنی جلد فرو نہ ہوتی."

رسل نے اپنی ڈائری میں یہ سوال یوں حل کیا ہے :-

"یا تو یہ محض ایک فوجی بغاوت تھی. یا عام بغاوت تھی. چوں کہ یہ بغاوت محض فوجوں تک محدود تھی، اس لیے دیہات اور شہر کے باشندوں کو محض اس بنا پر موت کی سزائیں دینا کہ انھوں نے سپاہیوں کی بغاوت فرو کرنے میں انگریزوں کا ساتھ نہ دیا، کسی قدر تہذیب سے گرا ہوا فعل تھا. ہم لوگوں کے ہمدردانہ جذبات کو جرم نہیں قرار دے سکتے. ہمیں چاہیے تو یہ تھا کہ اپنے دشمنوں کو جنگ کے میدان میں تباہ کریں. لیکن تمام علاقے کو محض اس بنا پر سزا دینا کہ اس میں کچھ جرائم واقع ہوئے تھے، یا باغی سپاہیوں نے اس میں

ڈیرا ڈالا تھا۔ ایک ایسا شنیع فعل ہے کہ کوئی سمجھدار آدمی اس سے نفرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس بغاوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دو قوموں کے درمیان ایسی سخت نفرت قائم ہو گئی ہے کہ اس کے دور کرنے کے واسطے بہت عرصہ چاہیے باہمی اعتبار بالکل زائل ہو گیا ہے، اور امید نہیں کہ وہ پھر عود کر سکے۔"

ہومز ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"دہلی کے باشندوں نے باغیوں کے جرائم کا کفارہ گن گن کر دیدیا۔ ہزارہا مرد اور عورتیں شہر کے مضافات میں آوارہ پھر رہے تھے۔ نہ ان کے پاس سامان خورد و نوش تھا، نہ ان کے قیام کے لیے کوئی مکان تھا جو کچھ ان کا اثاث البیت تھا، وہ انگریزی سپاہیوں نے لوٹ لیا تھا۔ انھوں نے دہلی کی فتح کے بعد ہر ایک مکان کی تلاشی لی تھی اور جو کچھ وہاں ملا تھا، لوٹ لے گئے تھے، عورتوں کی بڑی تعداد نے اپنے آپ کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ ہم نے انھیں ایک محفوظ جگہ پر پہنچا دیا تھا۔ ہمیں ان دنوں ایسی شریف زادیوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا، جو بڑی مشکل سے اپنے بچوں کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے رستوں پر ڈگمگاتی پھرتی تھیں کیوں کہ وہ اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر چلنے کی عادی نہ تھیں۔"

رومیش دت ہندوستان کی تاریخ کے صفحہ ۲۲۴ پر لکھتا ہے:۔

"ہر ایک سمجھدار انگریز اور ہندوستانی اس بات کا خواہاں ہے کہ بغاوت کے افسوسناک حوادث کو مدارس کی تعلیمی کتابوں سے حذف کر دیا جائے تاکہ بچوں کے دماغ میں یہ زہر سرایت نہ کر سکے۔ جب سے انگریزوں نے ہندوستان پر تسلط جمانا شروع کیا، ان کی راجوں اور نوابوں سے ہمیشہ لڑائیاں ہوتی رہی ہیں لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ ماننا پڑتا ہے کہ ان لڑائیوں میں فریقین نے اس قدر ظلم برپا نہیں کیے تھے، جیسے کہ غدر کے دنوں میں ہوئے۔ باغیوں نے اس خیال سے بغاوت کا علم بلند کیا تھا کہ وہ اپنے مذہب اور قومیت کی خاطر

لڑ رہے تھے۔ لیکن انھوں نے بے گناہ عورتوں اور بچوں کو قتل کرکے اپنی قوم اور مذہب کی سخت توہین کی۔ دوسری طرف سے انگریزی فوجوں نے بھی سیکڑوں میلوں کے محاذ میں بے شمار گاؤں جلا ڈالے اور بے شمار بے گناہوں کا خون بہایا۔ انھوں نے دہلی کے باشندوں کا قتل عام کیا۔ حالاں کہ باغی پارٹی (جو واجب القتل تھی) شہر چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ اسی طرح انگریزی کمشنروں نے شمالی ہند میں ہزاروں بے گناہ آدمیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ جنھوں نے غدر میں مطلقاً حصہ نہیں لیا تھا۔"

جن واقعات کا میں نے ذکر کیا ہے۔ انھیں کسی خاص خصوصیت کی بنا پر منتخب نہیں کیا گیا۔ بہت سے حوادث غدر ان سے بھی زیادہ ہولناک قسم کے میرے علم میں آئے ہیں جن کا ذکر میں پسند نہیں کرتا بعض لوگ خیال کریں گے۔ مجھے اس افسوسناک معاملہ کی یاد تازہ نہ کرنی تھی۔ لیکن میں نے اس لیے یہ داستان غم از سر نو چھیڑی ہے تاکہ ایک معاملہ کا فیصلہ ہو جائے۔ ایک طرف انگریز ہیں جو اب تک ۱۸۵۷ء کے ہندوستانی مظالم فراموش کرنا نہیں چاہتے اور یکے بعد دیگرے ایسی تاریخیں لکھی جا رہی ہیں جن میں صرف تصویر کا ایک ہی رخ نمایاں کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف ہندوستانی ہیں، اور وہ بجا طور پر محسوس کرتے ہیں کہ آج تک ان کے خیالات و احساسات کی بالکل شنوائی نہیں ہوئی۔ ایک مورخ نے بھی اس کی ضرورت نہ سمجھی کہ تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کی بھی کوشش کرے۔ میری رائے میں انصاف اور دیانت داری کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو دونوں فریق یہ معاملہ یک قلم بھلا دیں۔ یا پھر دونوں کو اپنا اپنا نقطۂ خیال ظاہر کرنے کا موقع دیا جائے۔

لارڈ رابرٹ کے وہ خطوط جو غدر ۱۸۵۷ء میں انھوں نے لکھے تھے، اب ۱۹۲۳ء میں چھاپ کر شایع کیے گئے ہیں۔ اگر برطانیہ کو ہندوستان سے ذرا بھی ہمدردی ہوتی تو یہ کتاب اب ہرگز شایع نہیں کی جاتی۔ ہندوستانیوں کے خلاف سخت زہر اگلا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر نیل (Naill) کی سفاکانہ حرکات کا (جو کانپور کے حادثہ سے بھی دہشت ناک تھے) ذکر نہیں کیا ہے نہ ہی میں نے ہاڈسن کے شنیع افعال کو (جس نے ہمایوں کے مقبرے کے قریب دو مغل شاہزادوں

کو بلا وجہ قتل کیا تھا) اس کتاب میں درج کرنا مناسب سمجھا ہے۔ کئی چشم دید گواہوں کے بیانات بھی حذف کر دیے ہیں، جن کا بیان ہے کہ سیکڑوں دیہات جلا دیے گئے اور ان میں بوڑھے مرد اور پردہ نشین عورتیں بھی جل کر راکھ ہو گئیں۔

غدر کے تاثرات جنوبی ہند اور بنگال تک نہیں پھیلے۔ لیکن بہار سے لے کر شمال مغربی سرحد تک غدر کی یاد اب تک تازہ ہے۔ اس علاقہ کے ہندوستانیوں اور انگریزوں دونوں نے ابھی تک فراموش نہیں کیا ہے۔ اس لیے اس کی یاد ان دونوں قوموں کے باہمی تعلقات میں رخنہ اندازی کرتی رہتی ہے۔ جب کبھی کہیں ذرا سا فساد ہوتا ہے تو ہندوستان کے انگریز باشندے چلا اٹھتے ہیں "مارشل لا فی الفور نافذ کیا جائے۔" کیوں کہ انھیں ہر وقت اپنی جانوں کا خطرہ رہتا ہے اگر غدر کے افسانے انگریزی تواریخ میں ایسے خوفناک طریقہ سے درج نہ کیے جاتے تو انگریزوں کے دلوں میں اس قسم کا ہیجان ہرگز پیدا نہ ہوتا۔ جب کبھی انگریز یہ جھوٹے قصے پڑھتے ہیں تو ان کے دلوں میں ہندوستانیوں کے خلاف ایک عالم گیر نفرت پیدا ہو جاتی ہے، اور خواہ مخواہ کوئی بہانہ پیدا کر کے انتقام لینے پر تل جاتے ہیں۔ میں ذیل میں تین ایسے واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس سے عہد غدر کے بعد خیالات کا اندازہ لگ سکتا ہے:

تین واقعات

(کوکوں کی بغاوت)

(۱) "۱۴ر جنوری ۱۸۷۲ء کو تقریباً ایک سو انتہا پسند سکھوں نے (جنھیں پنجابی زبان میں کوکہ بھی کہتے ہیں) مالیر کوٹلہ کے شہر پر دھاوا مار دیا۔ فریقین کے درمیان سخت لڑائی ہوئی اور دونوں طرف سے بہت سے آدمی مقتول اور مجروح ہوئے۔ سکھوں کی طرف سے ۸۰ آدمی (جن میں ۲۲ مجروح بھی تھے) بھاگ کر ریاست پٹیالہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ لیکن دوسرے ہی دن انھوں نے انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور انھیں شیرپور کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ کوون نے جو لدھیانہ کا ڈپٹی کمشنر تھا، ان قیدیوں کو کوٹلہ میں بلوایا۔ (جہاں وہ خود ۱۶ر تاریخ کو پہنچ گیا تھا) اس نے اپنے کمشنر کو اسی وقت اطلاع بھیجی کہ اب امن وامان ہو گیا ہے اور کل صبح قیدیوں کو

توپ کے ذریعے اڑا دیا جائے گا، ۔ اجنوری کو کمشنر نے کوون کو حکم دیا کہ قیدی فی الحال شیرپور کے قلعہ ہی میں رکھے جائیں لیکن کوون نے تعمیل حکم سے گریز کیا اور اسی روز بیرسی تحقیقات کے ۴۳ قیدی توپ سے اڑا دیے گئے۔ شام کے ۷ بجے کمشنر کا ایک اور حکم ملا۔ اس وقت ۶ قیدی توپ کے سامنے بندھے ہوئے تھے۔ کمشنر نے لکھا تھا کہ تمام قیدی بلا تاخیر اس کے پاس بھیجدیے جائیں تاکہ وہ ان کے مقدمہ کی سماعت کرے۔ لیکن کوون نے اس حکم کی بھی مطلق پروانہ کی۔ اور اس گروہ کو بھی توپ سے اڑا دیا۔ جب گورنمنٹ نے اس کی نافرمانی کے متعلق بازپرس کی۔ تو اس نے جواب دیا۔ "جب مجھے کمشنر کا حکم ملا تو میں نے سوچا ، اگر اس وقت ان ۶ آدمیوں کو (جو توپوں سے بندھے ہوئے ہیں) قتل نہ کیا گیا تو حاضرین پر برا اثر پڑے گا۔ اور اس تاخیر سے ہماری کمزوری ثابت ہو گی۔ اس لیے میں نے انھیں قتل کرا دیا۔" ایک قیدی اپنے محافظوں سے بھاگ نکلا تھا اس نے آتے ہی کوون پر حملہ کر کے اس کی داڑھی پکڑ لی۔ لیکن ہندوستانی افسروں نے اسے تلوار ول سے ڈھیر کر دیا۔ فارستھ (کمشنر) نے کوون کو کئی دفعہ حکم دیا تھا کہ قانون کے مطابق کارروائی کرنی چاہیے مگر اس نے نافرمانی کی۔ علاوہ ازیں کمشنر نے گورنمنٹ کو تار بھی دیدیا تھا کہ میں موقع پر موجود ہوں۔ اور میں ان قیدیوں کے مقدمات کا بغیر کسی تاخیر کے فیصلہ کر سکتا ہوں۔ مجھے اس وقت کسی فوری کارروائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کیوں کہ ممکن ہے اس سے جوش زیادہ پھیل جائے۔ لیکن جب ڈپٹی کمشنر نے اسے اطلاع دی کہ اس نے بہت سے قیدی قتل کرا دیے ہیں تو کمشنر نے اس کا جواب یوں دیا۔

"میرے پیارے کوون۔ جو کچھ آپ نے کیا ہے۔ بہت اچھا کیا ہے۔ میں نے آپ کا طرز عمل نہایت پسند کیا۔ میں بھی آپ کی تقلید کروں گا۔"

چنانچہ جب بقیہ قیدی اس کے پاس بھیجے گئے تو اس نے بھی انھیں سزائے موت دے دی۔ جب گورنمنٹ آف انڈیا کو ان واقعات کا علم ہوا تو اس نے ایک بڑا لمبا چوڑا حکم لکھا اور کوون کے فعل کی سخت مذمت کی۔ اور اسے وحشیانہ حرکت سے منسوب کیا۔ بالآخر کوون کو برخاست کیا گیا۔ کمشنر کو بھی سخت ملامت کی گئی اور اسے ایک دوسرے صوبے میں اسی عہدے پر تبدیل کر دیا گیا۔ جب لارڈ نارتھ برک وائسرائے ہوئے تو فارستھ نے اس حکم کے خلاف

اپیل کی۔ وائسرائے نے اسے کاشغر کے ایک سیاسی وفد کا سرکردہ بنا کر بھیج دیا گیا جہاں اسے سیاسی خدمات کے عوض سر کا خطاب دیا گیا۔

اس وقت تمام انگریز افسروں اور اخباروں نے کووِن اور فارسِتھ سے ہمدردی ظاہر کی تھی۔ میں نے اپنی تمام زندگی میں ایسا دہشت ناک واقعہ نہیں دیکھا ہے۔ میری رائے میں گورنمنٹ نے ان دو افسروں کو برائے نام سزا دی۔ حالاں کہ وہ سنگین سزا کے مستحق تھے۔"

میں نے یہ تمام واقعہ حرف بہ حرف کاٹن کی کتاب "یاد ایام" Indian and home memories سے اخذ کیا ہے۔ کیوں کہ میں اس سے بہتر اس واقعہ کی تفصیل نہیں لکھ سکتا تھا۔

فارسِتھ اپنی سوانح عمری میں اسی واقعہ کے متعلق یوں لکھتا ہے :-

"چوں کہ میں کمشنر تھا اس لیے مجھے قتل کرنے کے کلی اختیار تھے۔ لیکن کووِن کو اس قسم کا کوئی اختیار نہ تھا۔ میں نے اسے لدھیانہ سے لکھ دیا تھا کہ وہ ان باغیوں کے مقدمہ کی سماعت کرے۔ لیکن جب تک میں اس کے پاس نہ پہنچ جاؤں، وہ کسی صورت میں ان قیدیوں کو سزا نہ دے۔ لیکن اس نے میرے اختیارات چھین کر قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور بغیر میرے حکم کے قتل کرا دیا۔ ناچار اس کے فعل کی ذمہ داری مجھے اپنے سر لینی پڑی اور اس سے متفق الرائے ہونا پڑا۔ کیوں کہ میں اسے غلطی کے نتائج سے بچانا چاہتا تھا۔ جب اسے ملازمت سے برطرف کیا گیا۔ تو میں نے اس کی ہر طرح سے امداد کی اور اس کے واسطے ہندوستان میں ہی ایک نہایت عمدہ ملازمت مہیا کر دی۔"

جنگ افغانستان

(۲) دوسرا واقعہ افغانستان کی دوسری جنگ سے تعلق رکھتا ہے میں اس وقت اس جنگ کے واقعات دہرانا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ یہ بڑی لمبی چوڑی داستان ہے۔ جب افغانستان اور برطانیہ کی آپس میں صلح ہو گئی تو کیگنری کو برطانیہ کی طرف سے بطور سفیر کابل میں متعین

کیا گیا۔ چند دنوں کے بعد کویگنری مع اسٹاف کے خود پٹھانوں کے ہاتھوں مقتول ہوا۔ جرنیل رابرٹ نے کابل پر چڑھائی کی۔ اور بڑی بہادری دکھا کر اکتوبر ۷۹ء میں فتح کر لیا۔ بعدازاں انتقامانہ کارروائیاں شروع ہوگئیں۔ کیوں کہ پٹھانوں نے ہمارے سفیر کو قتل کرکے ہمارے جھنڈے کی بڑی توہین کی تھی۔ کاٹن اپنی کتاب کے صفحہ ۱۷۲ میں لکھتا ہے کہ مارشل لا (جنگی قانون) فوراً نافذ کیا گیا۔ لوگوں کو گروہ در گروہ پھانسی دی جاتی تھی۔ امیر یعقوب خاں کو جلاوطن کرکے ہندوستان بھیجا گیا۔ گرد و نواح کے علاقے سامانِ خورد و نوش کی خاطر تباہ کیے جاتے تھے۔ دیہاتوں کا جلانا تو ایک روزمرہ کی کارروائی تھی۔

سر چارلس میکگیر یگر جو لارڈ رابرٹ کا چیف آف سٹاف تھا۔ اپنی سوانح عمری کے صفحہ ۱۳۶ میں مندرجہ ذیل فقرات لکھتا ہے:۔

"جب تک مجھے افغان قیدیوں کے جرم کا یقین نہ ہو جائے تب تک میں انھیں بے فائدہ سزا نہیں دوں گا۔ دفتر امور خارجہ کی رائے ہے کہ ایسی سزائیں دی جائیں جو عبرتناک اور جارحانہ ہوں۔ لیکن میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں ہر ایک مقدمہ میں پوری تفتیش کرنی چاہیے۔ میں بے گناہ لوگوں کو قتل کرنا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ اس سے برے نتائج نکلتے ہیں۔"

یہی جرنیل اپنے روزنامچہ میں ۲۲ اکتوبر کا یہ واقعہ لکھتا ہے:۔

"میں نے آج ۵ آدمیوں کی زندگی بچائی ہے۔ یعنی اگر میں ان کے مقدمات میں پوری طرح غور و خوض نہ کرتا۔ تو انھیں یقیناً پھانسی دی جاتی۔ ان ملزموں میں سے ایک کا نام ابو بکر تھا۔ جو سوداگر تھا۔ اس کے خلاف مقدمہ صریحاً بناوٹی تھا۔ کیوں کہ اس کے جانی دشمن نے اس کے خلاف جھوٹی شہادت دی تھی۔"

(الہلال: ۲ دسمبر ۱۹۲۷ء)